ڈبل رول

انشائیے اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین

DOUBLE ROLE
BY MUHAMMAD ASADULLAH

'انشائیہ کی روایت، مشرق ومغرب کے تناظر میں' ۔ تاثرات

☆ مجھے خوشی ہے کہ فی زمانہ جب انشائیہ نگاری سے لوگوں کی دلچسپی بہت کم ہوگئی ہے، آپ نے انشائیہ کے موضوع پر اتنی عمدہ کتاب لکھ کر انشائیہ کو از سر نو ادب کے مرکزی دھارے میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔

فضیل جعفری

☆ آپ نے مطالعہ ادب کے ایک اہم گوشے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر اور مقالے کو کتابی شکل میں لا کر قابل تحسین کام انجام دیا ہے۔ جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے، انشائیہ کے موضوع پر ہندوستان میں اتنی شرح وبسط سے پہلے کبھی نہیں لکھا گیا۔ اس صنف نثر کے بارے میں ابھی تک بہت سوں کے ذہن صاف نہیں ہیں اور خلط مبحث کا شکار ہیں۔ مزاحیہ اور تاثراتی مضامین کو انشائیہ کہنے کی روش ابھی جاری ہے، حالانکہ انشائیہ کی وہ بنیادی خصوصیت جسے ذہن کی آزاد ترنگ(a loose sally of mind) کہا گیا ہے، اس نوع کے مضامین میں مفقود ہوتی ہے۔ مزاحیہ، تاثراتی اور اسی طرح کے دیگر مضامین ایک موضوع اور واضح مرکزی خیال کے تحت منضبط انداز میں لکھے جاتے ہیں، جب کہ انشائیہ بنیادی طور پر قطعی غیر منضبط تحریر پر مبنی ہوتا ہے۔ ذہنی رو جس طرف لے جائے وہ ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے۔ آپ نے انشائیہ کو ایک الگ صنف کے طور پر موضوع گفتگو بنا کر اس کے امتیازی اوصاف واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ امید ہے ادبی حلقوں میں اس کی کما حقہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حنیف کیفی

☆ ڈاکٹر اسد اللہ نے صنفِ انشائیہ کے سلسلے میں پھیلائی گئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نہایت موثر انداز میں انشائیے کے عقبی دیار، اس کے ارتقائی اور خاص طور پر اردو زبان میں اس کے تدریجی سفر پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر موضوع کو نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں ایک عام قاری کو کم صفحات میں وہ مواد دستیاب ہو جاتا ہے، جس کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہوتے ہیں۔ تحقیقی حوالے سے ان تمام اہم کتب کا حوالہ اس میں موجود ہے جو انشائیے کے خدوخال کو اجاگر کرنے میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فاضل مصنف نے اس ضمن میں پوری جانفشانی سے مصادر ومنابع تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، (پاکستان)

☆ امید رکھنی چاہئے کہ محمد اسد اللہ کی گراں قدر تصنیف 'انشائیہ کی روایت، مشرق ومغرب کے تناظر میں' منظر عام پر آنے سے ہندوستان کے ذہین اور انشائیہ سے محبت کرنے والے اہل قلم اس کی روشنی میں اس صنف کو نئی زندگی دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ یہ کتاب انشائیہ کے جتنے اسرار و رموز کھولتی ہے۔ اس سے نئے انشائیہ نگار مستفید ہو کر کامیاب انشائیہ تصنیف کرنے میں سرخ رو ہوں گے۔

عبد القیوم، (پاکستان)

☆ اس موضوع پر اب تک جتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ناچیز کی رائے میں آپ کی یہ تصنیف حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ کے سبھی پہلوؤں کو حیطہ تحریر میں لانے کے لئے آپ نے بڑی عرق ریزی کی ہے۔ اس وقیع اور معیاری پیش کش کے لئے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

سعید رحمانی، ایڈیٹر، ماہنامہ ادبی محاذ

☆ ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی تحقیقی تصنیف 'انشائیہ کی روایت ۔ مشرق ومغرب کے تناظر میں' ایک سنگِ میل قرار دی جا سکتی ہے۔ اس میں انھوں نے انشائیہ سے متعلق بنیادی موضوعات کا نہ صرف احاطہ کیا ہے بلکہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے مختلف دلائل اور مستند حوالے بھی پیش کئے ہیں۔

معین الدین عثمانی

ڈبل رول

انشائیوں

اور

طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

محمد اسد اللہ

محمد اسد اللہ

ڈبل رول

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی

نام کتاب	:	ڈبل رول (انشائیوں اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
مصنفہ	:	محمد اسد اللہ
پتہ	:	۳۰،گلستان کالونی، نزد پانڈے امرائی لانس، جعفر نگر، ناگپور (مہاراشٹر)
موبائل نمبر	:	(+91) 9579591149
سرورق ڈیزائن	:	توصیف احمد
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	توصیف احمد
مطبع	:	پٹیل فائن آرٹ، کامٹی، ضلع ناگپور ۴۴۱۰۰۱
ضخامت	:	۱۲۸ صفحات
قیمت	:	۸۱/روپیے
تعداد	:	۵۰۰
سالِ اشاعت	:	نومبر ۲۰۱۵
ملنے کے پتے	:	۳۰۔گلستان کالونی، نزد پانڈے امرائی لانس، جعفر نگر، ناگپور ۱۳ صالحہ بک ٹریڈرس، نزد جامع مسجد، مومن پورہ، ناگپور۔ مکتبہ آزاد، نیپولین، گلزار باغ، پٹنہ، ۸۰۰۰۰۷ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنسس بلڈنگ، ای۔آر روڈ، ممبئی۔ ۳

DOUBLE ROLE

Inshaiye Aur Tanzia o Mizahiya Mazameen

انتساب

مرحوم احمد جمال پاشا کے نام

جنھوں نے

طنز و مزاح اور انشائیہ

کے فروغ کے سلسلہ میں

قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

شناس نامہ

نام	:	محمد اسد اللہ
والد کا نام	:	محمد مشرف
مقام پیدائش	:	ورود، ضلع امراوتی (مہاراشٹر)
تاریخ پیدائش	:	16 جون 1958
تعلیم	:	ایم۔اے۔(اردو، عربی، انگریزی، فارسی)، بی ایڈ، پی ایچ ڈی، ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن۔
ملازمت	:	مولانا ابوالکلام آزاد جونیئر کالج، گاندھی باغ، ناگپور
پتہ	:	30۔گلستان کالونی، پانڈے امرائی لانس (ویسٹ)، جعفر نگر ناگپور 440013
فون نمبر	:	+91 9579591149
ای میل	:	zarnigar2006@yahoo.com

انعامات واعزازات

'جمال ہم نشیں'، 'پر پرزے'، 'ہوائیاں'، 'خواب نگر' اور 'پیکر اور پر چھائیاں' کو مہاراشٹر، اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال اردو اکادمیوں کے انعامات، اردو مراٹھی خدمات کے لئے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکاڈیمی کا سیتو مادھو پگڑی ایوارڈ اور دو ڈراموں کو بہترین اسکرپٹ کے ایوارڈ کے علاوہ مختلف سماجی اداروں کے اعزازات

تصانیف

1۔جمالِ ہم نشیں	(مراٹھی مزاحیہ ادب کے تراجم)	1985
2۔بوڑھے کے رول میں	(انشائیے)	1991
3۔پرپرزے	(طنزیہ ومزاحیہ مضامین)	1992
4۔دانت ہمارے۔۔	(مراٹھی مزاحیہ کہانیوں کے تراجم)	1996
5۔ہوائیاں	(مزاحیہ مضامین، ریڈیو نشریات)	1998
6۔صبحِ زرنگار	(مرتّبہ یک بابی ڈرامے)	2001
7۔پرواز	(مرتّبہ کوئز)	2005
8۔خواب نگر	(بچوں کے لئے نظمیں)	2008
9۔پیکر اور پرچھائیاں	(تحقیقی وتنقیدی مضامین)	2012
10۔گپ شپ	(بچوں کے لئے کہانیاں ومضامین)	2013
11۔انشائیہ کی روایت، مشرق ومغرب کے تناظر میں	(تحقیق)	2015
12۔ڈبل رول	(انشائیے اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین)	2015

زیرِ طبع

۱۔ورق ورق انشائیہ (ماہنامہ اوراق، لاہور کے منتخب انشائیے)

۲۔بینار (مراٹھی کہانیوں کے تراجم)

مشمولات

انشائیے

طنزیہ ومزاحیہ مضامین

محمد اسد اللہ

ایک منفرد انشائیہ نگار

ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن

ڈاکٹر محمد اسد اللہ کا تعلق قدیم علاقہ برار سے ہے۔ وہ اس کے ایک مردم خیز اور ادبی اعتبار سے باشعور اور بیدار شہر وروڈ میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کے سلسلے میں ناگپور میں مقیم ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد جونیئر کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے اسی زمانے میں انھوں نے بڑی سرعت سے انشائیے تخلیق کئے جو ہندوپاک کے مقتدر رسائل ماہنامہ اوراق ،تخلیق ،ادبِ لطیف ،(لاہور)،آجکل ،تحریک، کتاب نما، (دہلی) شاعر (ممبئی) اور شگوفہ (حیدرآباد) میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر محمد اسد اللہ گو ناگوں صلاحیتوں کے مالک ہیں ۔انھوں نے تحقیقی مضامین، تبصرے اور خاکے لکھے، مراٹھی ادب پاروں کے تراجم بھی کئے ۔ وہ مراٹھی اور انگریزی پر بھی یکساں قدرت رکھتے ہیں ۔ان کی تصانیف میں جمالِ ہمنشیں، دانت ہمارے ہونٹ تمہارے (مراٹھی تراجم) پر پرزے، ہوائیاں، بوڑھے کے رول میں (انشائیے)

پیکر و پر چھائیاں (تحقیق وتنقید) اور صبح نگار کے علاوہ بچوں کے لئے لکھی گئی ان کی تین کتابیں، خواب نگر (نظمیں) ، گپ شپ ۔ (مزاحیہ مضامین اور کہانیاں) صبح زرنگار (مرتبہ ڈرامے) اور پرواز (کوئز) شامل ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ نگاری کی جس تحریک کو پروان چڑھایا، اس کے تحت انشائیہ نگاروں کا ایک مخصوص طبقہ وجود میں آیا جس نے انشائیہ میں طنز و مزاح کے ساتھ اپنے ذاتی تجربات اور انوکھی سوچ کو پیش کرنے کی کوشش کی اور اسلوب، موضوع اور طریقہ اظہار کے اعتبار سے منفرد قسم کی تخلیقات پیش کیں۔ڈاکٹر محمد اسد اللہ اس تحریک سے وابستہ ہوئے اور اپنی الگ پہچان بنائی۔ڈاکٹر وزیر آغا نے انھیں ایک انشائیہ نگار تسلیم کرتے ہوئے انشائیہ نگاری کی اس تحریک میں شامل ہونے والے تین انشائیہ نگاروں میں شمار کیا ہے۔ڈاکٹر انور سدید اور احمد جمال پاشا نے انھیں ایک ممتاز انشائیہ نگار لکھا ہے۔ان کے انشائیے بخار کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

> بخار کے بارے میں لوگ باگ کچھ بھی کہیں، ڈاکٹروں کی رائے جو بھی ہو میرا یقین ہے کہ بخار انسان کی ایک اندرونی ضرورت ہے۔ بخار ہماری ہڈّیوں اور خون کی تہ نشیں موجوں میں بے کسی کی زندگی گذارتا ہے ۔ اندر ہی اندر لاوے کی طرح پکتا رہتا ہے۔ ہماری شخصیت کے وہ اجزا جنھیں اپنی کسمپرسی اور عدم توجّہی اور زمانے کی نا قدری کا احساس آتش زیر پا رکھتا ہے، جسم کے اندر یکجا ہونے لگتے ہیں۔ ہماری سوچوں کے پنڈال مین جلسے منعقد ہوتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، زمانے کو کوسا جاتا ہے اور ایسی جگہ سے بھاگ چلنے کا مشورہ ہوتا ہے جہاں چارہ گر کوئی نہ ہو اور نوحہ خواں کوئی نہ ہو۔

ہماری ہستی کے ایسے تمام بے کل اجزا کا یہ مجمع جسم کے شہر میں شہر بند کا نعرہ لگا کر ہڑتال پر نکل پڑتا ہے تب جسم و جاں سلگنے لگتے ہیں۔ چھینکوں پر چھینکیں آنے لگتی ہیں ۔ دردِ سر ہمارے پورے وجود کا احاطہ کرلیتا ہے، تب آس پاس کے لوگ دوڑ دوڑ کر آتے ہیں۔ خیریت دریافت کرتے ہیں ۔ بھئی کیا ہوا، بخار کیسے آ گیا؟ اس قدر دوڑ دھوپ اچھی نہیں، کچھ اپنی صحت کا خیال رکھو، وغیرہ وغیرہ۔ تسلّی کے یہ کلمات دواؤں کی مہک کی طرح فضا میں بکھر جاتے ہیں ۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ۔ ہمارے اندر چھپا بیٹھا بخار بھی دراصل یہی چاہتا ہے کہ کوئی ہمارے حال پر ترس کھائے اور ہمدردی کے دو میٹھے بول بول کر ہمارا کلیجہ ٹھنڈا کردے ۔ ہم رات دن جن لوگوں کے لئے مرے جا رہے ہیں انھیں ہماری خدمات کا احساس ہو۔

محمد اسد اللہ کی ادبی زندگی کا نمایاں حصہ ان کی انشائیہ نگاری ہے جس کی وجہ سے انہیں ایک بلند مقام حاصل ہے ۔ ان کا شمار صفِ اول کے انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے ۔ وہ انشائیہ کے مزاج اور تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ انشائیہ کی تکنک بیان کرتے ہوئے محمد مسعود انوران کے انشائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وزیر آغا سے لے کر محمد اسد اللہ تک ادیبوں کے انشائیوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان سب میں ایک خاص نوعیت کا نظم وضبط اور موضوع کے انتخاب سے لے کر منتخبہ موضوع پر اظہارِ خیال میں ایک مخصوص نوعیت کی تکنک نظر آتی ہے ۔ کامل القادری اور محمد اسد اللہ کے ہاں نکتہ آفرینی کا زاویہ زیادہ روشن ہے۔

محمد اسد اللہ نے مراٹھی کے مشہور ادیبوں کی تخلیقات کے تراجم اردو میں پیش کئے ہیں۔اس سلسلہ میں ان کی اولین کتاب جمالِ ہمنشیں میں مراٹھی مضامین، کہانیاں اور یک بابی ڈرامے شامل ہیں یہ سب طنزیہ و مزاحیہ تحریریں ہیں۔ان کی کتاب دانت ہمارے ہونٹ تمہارے، مراٹھی کے مشہور مزاح نگار رمیش منتری کے مختلف مزاحیہ افسانوں اور کہانیوں کا اردو ترجمہ ہے۔یہ کتاب مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادیمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔پیش لفظ یونس اگاسکر کا تحریر کردہ ہے۔اس کتاب کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر محمد اسد اللہ کو مراٹھی ادب سے لگاؤ ہے وہ خود بھی اردو کے اچھے انشائیہ نگار ہیں اور ان کی تحریر میں طنز و مزاح کی نمکینی پائی جاتی ہے۔ صرف ایک مصنف کو چن کر اس کی منتخب تحریروں کا ترجمہ پیش کرنے کا خیال عموماً پذیرائی کا مستحق نہیں سمجھا جاتا لیکن میں اسے مراٹھی اور اردو کے درمیان استوار ہوتے ہوئے رشتے کے استحکام کے لئے ایک نیک فال سمجھتا ہوں اور ڈاکٹر محمد اسد اللہ کو اس اقدام پر مبارک باد دیتا ہوں۔امید کرتا ہوں کہ ان کی تازہ کتاب دانت ہمارے ہونٹ تمہارے اردو والوں کے ادبی ذوق کی تسکین کا باعث ہوگی۔

اس کتاب کے متعلق ضروری توضیحات، مراٹھی مزاحیہ کہانیوں پر تبصرہ اور رمیش منتری کا تعارف مترجم نے پیش کیا ہے۔کتاب کا انتساب بہت معنی خیز ہے اور بڑی بے باکی کے ساتھ اسد اللہ نے ایک سوال قائم کیا ہے۔اس انتساب میں وہ لکھتے ہیں :

ان بے خبر لوگوں کے نام جو مراٹھی زبان و ادب پر ہنسنے کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔

محمد اسد اللہ نے ذریعہ معاش کے لئے پیشہ تدریس اختیار کیا۔ان کا واسطہ قوم

کے نونہالوں اور نوجوانوں سے ہوا۔ وہ چونکہ ایک دیانت دار مدرس ہیں، انھوں نے اپنے شاگردوں کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ طلباء کے تعلیمی نصاب اور ان کے لئے لکھے جارہے ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور اندازہ لگایا کہ ان کے لئے وہ کتنا مفید اور کارگر ہے۔ اس میں اصلاح کی کس قدر ضرورت ہے۔

محمد اسد اللہ نے بچوں کی فطری ضروریات اور ان کی نفسیات کے پیشِ نظر لکھنا شروع کیا۔ طلباء کے ذریعے اہم شخصیات کے انٹرویوز کروائے،　ڈرامے لکھے، اپنے طلبا کی مدد سے انھیں اسٹیج پر پیش کیا، کہانیاں لکھیں، نظمیں لکھیں اور اسکول میں مختلف جلسے، تربیتی کیمپ، کوئز کے مقابلے، رائٹنگ اورکشاپ اور ڈراما ورکشاپ ،منعقد کروائے۔

محمد اسد اللہ کی کتاب 'پیکر اور پرچھائیاں' ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے ۔ کتاب میں شامل مضامین کے متعلق اعتراف میں ڈاکٹر اسد اللہ نے جامع الفاظ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب میں شامل تحریریں مختلف ادبی مجالس، سیمینار اور رسائل کی تقاضوں کے تحت سپردِ قلم کی گئی ہیں۔ س کتاب میں شامل پانچ مضامین مزاحیہ ادب سے تعلق رکھتے ہیں ۔اس کتاب کا ایک مضمون ودربھ میں افسانہ نگاری کا ارتقاء　ہے یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں ودربھ کے تمام افسانہ نگاروں کے مختصر حالات اور ان کی تخلیقات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ برصغیر کے چند اہم انشائیہ نگاروں میں شمار ہونے والے محمد اسد اللہ اپنے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع کر کے ناقدین اور محققین کی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں۔

ماخوذ از: شخصیاتِ ودربھ　　　ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن　　۲۰۱۵ء

طنزیہ ومزاحیہ مضمون اور انشائیہ

اردو میں طنزیہ وظریفانہ مضامین کو انشائیہ قرار دینے کا رواج عام ہے۔اس میں اخباروں کے کالم، ہلکے پھلکے شگفتہ مضامین، خاکے وغیرہ سبھی پر انشائیہ کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ان تحریروں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی ادیب اپنے مضمون میں بھرپور طنز ومزاح کو بروئے کار نہ لاسکے یعنی وار او چھا پڑ جائے تو اسے بھی انشائیہ سمجھ لیا جاتا ہے گویا ایک ناکام قسم کا مضمون انشائیہ ہو گیا! بقول ڈاکٹر سید محمد حسنین

انشائیہ نگاری کو مزاح نگاری قرار دینا بڑی مضحکہ خیز سی بات ہے۔

طنز ومزاح، ہجو، المیہ، رومان یہ تحریر کی خوبیاں ہیں، تحریر کی صورتیں نہیں ان صفات کو صنف کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ ایک صنفِ ادب ہے نہ کہ کسی صنف کا اندازِ تحریر۔اس سلسلے میں انشائیہ کی امتیازی حیثیت کو انیس ناگی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

مقالہ یا مضمون سیال قسم کی ادبی ہیئت ہے جو تصور یا جذبہ کے ساتھ مختلف رنگ اختیار کرتی ہے اس لیے اس کی کوئی معین ہیئت

نہیں ہے یہ موم کی ناک ہے ۔ اگر ہنسی مذاق پھبتی اور جگت سے
انشائیہ جنم لیتا ہے تو پھر نقال بہت بڑے انشا پرداز ہیں اور تہواروں
پر جواب الجواب اور تمسخر انشائیوں کے مجموعے ہیں ۔ 1

اردو میں طنز وظرافت کی تخلیق دیگر اصناف کی بہ نسبت بیشتر مضمون ہی کے فارم میں ہوئی ہے ۔ انشائیہ کے فنی آداب و رموز سے بے خبری کے سبب ان تمام تحریروں کو انشائیہ کے زمرے میں شامل کرنے کا رجحان عام رہا ہے ۔ طنز ومزاح کی شوخی اور انشائیہ کی شگفتگی کی علاحدہ پہچان نہ ہو سکی ۔ اسی لئے جو طنز ومزاح نگار ہے وہ انشائیہ نگار بھی گردانا گیا جب کہ یہ دونوں اصناف الگ خواص اور طریقہ کار کو اپناتے ہیں ۔

انشائیہ طنزیہ وظریفانہ مضامین سے مختلف قسم کے اظہار کا پیمانہ ہے ۔ اس میں طنز ومزاح متوازن مقدار میں ایک معاون قوت کے طور پر بروئے کار لایا جاتا ہے لیکن یہ عناصر اپنی طبعی صلاحیتوں کے ساتھ کسی مضمون میں اپنے فرائضِ منصبی سے عہدہ برآ ہونے لگیں، اس تحریر کا غالب رجحان بن جائیں اور زندگی یا کائنات کے مظاہر سے متعلق کسی انوکھے نقطہ نظر کو پیش کرنے کا وہ مقصد جو انشائیہ کے پیشِ نظر ہوتا ہے فوت ہو جائے تو اس صورت میں وہ تحریر طنز وظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کے باوجود انشائیہ نہیں کہلا سکتی ۔ اسے طنزیہ مزاحیہ مضمون ہی کے زمرے میں شامل کرنا ہوگا ۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں ۔

'طنزیہ مزاحیہ مضامین انشائیہ نگاری کے مختلف اسالیب نہیں بلکہ قطعاً الگ قسم کی تحریریں ہیں اور یہ فرق محض لہجہ اور انداز کا فرق نہیں مزاج کا فرق بھی ہے ۔ مثلاً غور کیجئے کہ ایک مزاحیہ مضمون کا طرّہ امتیاز یہ ہے کہ اس میں فاضل جذبہ خارج ہو جاتا ہے جب کہ انشائیہ میں جذبہ صرف ہوتا ہے' ۔ 2

ڈبل رول
محمد اسد اللہ

انشائیہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضمون میں جذبہ کے صرف ہونے کی نوعیت مختلف ہونے کی وجہ سے ان دونوں سے پیدا ہونے والا تاثر بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ انشائیہ چونکہ فطری اظہار اور انشائیہ نگار کے خیالات و تاثرات کا آئینہ ہوتا ہے نیز ایک متوازن اور مہذب شخصیت کا اظہارِ خیال ہے اس لئے اس میں ایک ٹھہراؤ اور لطیف انداز پایا جاتا ہے۔

طنز و مزاح ایک شعوری کاوش کے طور پر تحریر کی مجموعی فضا پیدا کرتا ہے جو اس کے مخصوص ارادوں اور مقاصد کی نمائندگی سے عبارت ہے۔ اس میں طنز اور مزاح الگ الگ رول ادا کرتے ہیں۔ اسٹیفن لی کاک کے بقول:

> مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا اظہار فنکارانہ طور پر کیا گیا ہو۔

کلیم الدین احمد طنز و ظرافت کے فرق کو یوں سمجھاتے ہیں :

> 'خالص ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی شے کو دیکھ کر ہنستا ہے اور پھر دوسروں کو ہنساتا ہے وہ اس نقص، خامی، بدصورتی کو دور کرنے کا خواہش مند نہیں۔ ہجو گو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے اس ناقص ناتمام منظر سے اس کا جذبہ تکمیل حسن، موزونیت اور انصاف جوش میں آتا ہے اور اس جذبہ سے مجبور ہو کر اس مخصوص مذموم منظر کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ نظری اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ خالص ظرافت اور ہجو کی راہیں الگ الگ ہیں اور منزلیں جدا جدا ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کو جدا کرنا عموماً دشوار ہے۔3'

طنز اور ظرافت یا ہجو کو الگ کرنا دشوار سہی لیکن ناممکن نہیں۔ اسے کسی بھی فن پارے میں یا عملی زندگی میں علاحدہ کرنے میں جو دشواری پیش آتی ہے اس کی اصل وجہ یہ

ہے کہ طنز یا ہجو کے ذریعے کسی برائی یا ناپسندیدہ عمل کا احساس دلایا جاتا ہے اور اس مقصد کے لئے طنز کرنے والا مبالغہ آرائی کا سہارا لیتا ہے اسی لئے چسٹرٹن کے مطابق:

ایک سوّر کو اس سے بھی زیادہ مکروہ شکل میں پیش کرنا جیسا کہ خود خدا نے اسے بنایا ہے طنز یا تضحیک سٹائر Satire ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ طنز کا اصل مقصد ناپسندیدہ افعال یا مظاہر کی روک تھام ہے۔ اور مزاح جو اسٹےفن لی کاک کے مطابق زندگی کی ناہمواریوں کے شعور کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اس کا مقصد بھی ناہمواریوں پر قہقہوں کے ذریعے ایک نرم قسم کی تنقید ہی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے :

ہنسی ایک ایسی لاٹھی ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا گلہ بان محض شعوری طور پر ان تمام افراد کو ہانک کر اپنے گلّے میں دوبارہ شامل کرنے کی سعی کرتا دکھائی دیتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے گلّے سے علاحدہ ہو کر بھٹک رہے تھے۔ یعنی ہنسی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے سوسائٹی ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے جو اس کے ضابطہ حیات سے بچ نکلنے کی سعی کرتا ہے۔4

مقصد کے اعتبار سے طنز اور مزاح میں ناہمواریوں اور عدم توازن پر اظہارِ ناپسندیدگی ایک قدرِ مشترک ہے اس اعتبار سے یہ بات انشائیہ کے سلسلے میں ایک نیا زاویہ نظر مہیا کرتی ہے کہ انشائیہ ایک غیر مقصدی صنفِ ادب ہے۔ طنز و مزاح کے ذریعے جن جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے انشائیہ میں یہ عناصر ان مقاصد کے ساتھ رچ بس نہیں سکتے۔ دوم یہ کہ برہمی یا بہجت کے جذبات طنزیہ مزاحیہ تحریر میں طنز و ظرافت کی شکل میں ایک ردِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جب کہ انشائیہ میں ان جذبات کی فقط عکاسی ہوتی ہے شاید ڈاکٹر وزیر آغا کے قول کے مطابق فاضل جذبے کے خارج ہونے

اور صَرف ہونے کے مابین بھی یہی فرق ہے۔اسی مختلف ردِّ عمل اور طریقہ کار کو سمجھانے کی غرض سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

'طنز میں ادیب ایک مصلح کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا وہ فراز پر کھڑا ہو کر نشیب کی ہر چیز پر ایک استہزائی نظر ڈالتا ہے مزاح میں ادیب استہزا اور ہیئت کذائی کا خود نشانہ بنتا ہے۔دوسرے لفظوں میں وہ نشیب میں گر کر ناظر کے جذبہ ترحم کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ بھی اس طرح کہ پہلے ناظر کے لبوں پر قہقہہ بیدار ہوتا ہے پھر دل کی کسی اندرونی گہرائی میں رحم کا جذبہ، انشائیہ میں ادیب ایک ہموار سطح پر ناظر کے دوش بہ دوش کھڑا ہو کر منظر سے تحصیلِ مسرت کرتا ہے اور اپنا ردِعمل بھی رواں دواں انداز میں بیان کرتا جاتا ہے۔5

ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ طنزیہ مزاحیہ مضامین سے قدرے مختلف چیز ہے۔یہ عناصر انشائیہ میں جگہ تو پا سکتے ہیں لیکن ان کی حیثیت معاون قوت ہی کی طرح ہے نیز انشائیہ میں ان کا مقام بھی وہی ہے جو ان دیگر اجزا کا ہے جن کی شمولیت انشائیہ میں ممکن ہے مثلاً ڈرامائیت، افسانوی انداز، شاعرانہ احساس ،فلسفیانہ تفکر وغیرہ ،لیکن ان تمام یا کسی ایک عنصر کی موجودگی میں بھی انشائیہ انشائیہ ہی رہے گا نہ کہ ڈرامہ، افسانہ یا شاعری کہلائے گا۔اسی طرح ان ہی اصناف میں اگر انشائیہ کی کوئی خصوصیت در آئے تو محض اسی بنیاد پر اسے انشائیہ کے زمرے میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں پائے جانیوالے اس تصور کے باوجود کہ مزاح یا طنز اور انشائیہ ایک ہی چیز ہے، انشائیہ کی فنی اور فکری تنظیم وتشکیل، شگفتگی اور شوخی کی متحمل تو ہو سکتی ہے مگر اس کا وجود لازمی نہیں ہے۔انشائیہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین سے قطعی مختلف قسم کے مزاج، طریقہ کار

اور تاثر کو جنم دیتا ہے۔ اسی لیے ان دونوں کے درمیان واضح حدِّ فاصل موجود ہے۔

حواشی

1۔ انیس ناگی، بحوالہ: انشائیہ کی بنیاد، ڈاکٹر سلیم اختر، 1986 ص 365

2۔ ڈاکٹر وزیر آغا، انشائیہ کا سلسلہ نسب، مشمولہ : تنقید اور مجلسی تنقید، نئی دہلی، 1982، ص 53

3۔ کلیم الدین احمد، اردو میں طنز وظرافت، مشمولہ : طنز ومزاح۔ تاریخ وتنقید، مرتّبہ : طاہر تونسوی، دہلی 1986 ص 27

4۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز ومزاح،، نئی دہلی، 1978 ص 24

5۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو انشائیہ، مشمولہ : ذکر اس پری وش کا، سر گودھا، 1982 ص 30

ماخوذ از : 'انشائیہ کی روایت، مشرق ومغرب کے تناظر میں'۔ محمد اسد اللہ

پسِ پردہ

کسی دانا کا قول ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے، مگر پیدائش بچہ کی ہو یا کسی کتاب کا زیورِ طبع سے آراستہ ہونا، پہلا سوال یہی پوچھا جاتا ہے، نام کیا رکھا ہے؟ زیرِ نظر کتاب کا نام ’ڈبل رول‘ محض اس لئے نہیں رکھ دیا گیا کہ اس میں کہیں کہیں ہماری قومی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کی وہ جھلکیاں موجود ہیں جہاں اکثر افراد ڈبل رول ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ڈبل رول کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں دو قسم کے مضامین الگ الگ خانوں میں رکھے گئے ہیں۔

۱۔ انشائیہ ۲۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین

ان کی دونوں کی پہچان میں ہم اکثر اسی طرح دھوکہ کھاتے ہیں جیسے جڑواں بچوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ جن ادبی روایات نے مذکورہ مضامین کو جنم دیا ہے، ان کی نسلی خصوصیات کا ان تحریروں میں موجود ہونا فطری امر ہے۔ ان دونوں اصناف (اور بعض ناقدین کے نزدیک اسالیب بیان) میں یہی ایک قدرِ مشترک ہے، اور انشائیہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں مغالطہ پیدا ہونے کا سبب بھی۔ ان دونوں کی صورتیں بھلے ہی جڑواں بھائیوں کی طرح ملتی جلتی کیوں نہ ہوں، میں سمجھتا ہوں، ان کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔

میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے مقطّع تیرا میرا میل نہیں

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

ان دونوں کو جڑواں بھائی تصور کر لیں تو کہا جا سکتا ہے کہ، ایک ہنس مکھ، چلبلا، زندہ دل ، بے تکلف ، بات بات پر لوگوں کو ہنسانے والا، مبالغہ آرائی کا شوقین، پھبتی کسنے میں ماہر، بڑا بے مروت اور بلا کا ذہین ہے ۔گاہے بگاہے خود اپنے آپ پر ہنسنے والا، دوسروں پر طنز کے تیر چلانے والا۔اس کا انداز استہزائیہ، اس کی ہنسی تمسخرانہ، مشاہدہ زبردست ، ہر کمزوری کو تاڑ کرتابڑ توڑ حملے کرنے والا، ڈھونگیوں اور بہروپیوں کی پول کھول کرر کھ دینے والا۔ایک طنزیہ ومزاحیہ مضمون ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس کے برعکس انشائیہ اگر چہ ہے اسی شکل وصورت کا، مگر ذرا مختلف قسم کا آدمی، اپنے آپ میں گم رہنے والا، شخصی اظہار کا خوگر، غور وفکر کا عادی ، متانت ، ذہانت اور حکمت و دانشوری کا پُتلا، خوش گفتار، نرم دمِ گفتگو، بات کرتے ہوئے سوچنے لگتا ہے اور سوچتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولنے لگتا ہے۔ اس کے خیالات فلسفیانہ اور باتیں شاعرانہ۔ہر چیز کو دیکھنے کا انداز دنیا جہاں سے نرالا۔اپنے ارد گرد بکھری ہوئی چیزوں کو اس طرح دیکھتا ہے، جیسے وہ واقعتا رکھی ہوئی ہیں اور انھیں اس انداز سے دیکھنے پر بھی قادر ہے جیسے وہ رکھی ہوئی نہیں ہیں۔اس کی خیال آرائی مظاہرِ عالم کو بہ اندازِ دیگر بھی سجاتی ہے اور وہ منظر لوگوں کو دکھا کر خوش ہوتا ہے۔سنا ہے حضرت لقمان جڑی بوٹیاں باتیں کیا کرتی تھیں، قدرتی مناظر انشائیہ نگار سے ہم کلام ہوتے ہیں۔اسے بتاتے ہیں کہ کائنات میں ان کی رشتہ داریاں کہاں کہاں ہیں۔وہ اپنے ذہنی فکری اور جذباتی تجربات اور محسوسات میں دوستوں کو شامل کرتا ہے۔اسے اپنے دوستوں کے درمیان گپیں ہانکنا پسند ہے۔ وہ دورانِ سفر دلچسپ باتیں کرتا جاتا ہے تب اس کے ہم قدم خود کو ایک نئی روشنی میں محوِ سفر پاتے ہیں۔وہ منچلا فکر وخیال کے ان ایوانوں میں بلا جھجک داخل ہو جاتا ہے جہاں لوگ باگ یہ سوچ کر نہیں جاتے کہ یہ ہمارے شایانِ شان نہیں اور شرفا ان وادیوں میں اس خیال سے قدم نہیں دھرتے کہ یہ شاہراہِ عام نہیں ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے نہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے حقوق ادا ہوئے اور نہ ہی میں انشائیہ کے ساتھ انصاف کر پایا۔ میں جانتا ہوں تخلیقی عمل نہ عبادت ہے نہ حقوق العباد کی ادائیگی، ایک ذہنی ترنگ ہے جو لفظوں میں اتر گئی ہے۔ میری کتاب 'انشائیہ کی روایت۔ مشرق و مغرب کے تناظر میں' جو اسی سال شائع ہوئی ہے، اس میں تنقیدی سطح پر انشائیہ کے متعلق اہلِ قلم کے خیالات اور نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ناچیز بھی اسی صنف میں طبع آزمائی کرتا رہا ہے، اسی کے ساتھ ظریفانہ رنگ میں بھی چند مضامین سپردِ قلم کئے تھے جو 'پر پرزے' اور 'ہوائیاں' کے نام سے کتابی شکل میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ 'بوڑھے کے رول میں' میرے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ اور اب یہ نئی کتاب 'ڈبل رول' ایک حقیر سی کوشش ہے ان دونوں اصناف میں لکھے گئے اپنے مضامین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی۔

انشائیہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین کو ایک حدِ فاصل کے ساتھ تنقیدی پیمانے پر پیش کرنے کے بعد تخلیقی سطح پر نمایاں کرنے کی یہ سعی، ایک جراتِ رندانہ سہی، مجھے امید ہے انشائیہ نگاری کے فروغ میں معاون ثابت ہوگی۔

اس کتاب کی اشاعت میں جن کرم فرماؤں نے میری رہنمائی فرمائی، نیک خواہشات کا اظہار فرمایا اور مشوروں سے نوازا، میں ان تمام کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ خاص طور پر ڈاکٹر وزیر آغا کے فرزند ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر سید صفدر، ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن، ڈاکٹر رضی الدین معروفی اور ریحان کوثر (مدیر، الفاظِ ہند)۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کا ممنون ہوں جس کی مالی اعانت سے یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔

محمد اسد اللہ

انشائیے

دوسرا ٹکٹ

بات بس اتنی سی تھی کہ اس دن میں بس میں سوار ہوا تو تنہا تھا پھر بھی دو ٹکٹ خریدے۔ کنڈکٹر کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا کہ آئے دن کئی لوگ اپنے ہم سفر کا سفر خرچ بخوشی ادا کیا کرتے تھے البتہ میرے ہم نشیں ایک ذاتِ شریف میری اس حرکت پر تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ انھوں نے اولین فرصت میں آس پاس بیٹھی جاذبِ نظر صورتوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی، مزید کچھ دور تک تحقیق کے گھوڑے دوڑائے، آخر ان کی باگیں میری طرف موڑتے ہوئے بولے۔ یہ دوسرا ٹکٹ آپ نے کس کے لئے خریدا؟
ایک دوست ہے ادھر اس مجمل سے جملہ اور حقیقتاً سفید جھوٹ کے ذریعے میں نے اس دفترِ تحقیقات پر تالے ڈال دئے۔
آپ کے لئے اطلاعاً عرض ہے کہ اس بس میں واقعی میرا اپنا کوئی دوسرا نہ تھا جس کی خاطر میں یہ زحمت اٹھاتا۔
آخر وہ دوسرا ٹکٹ تھا کس کے لئے؟
شروع میں یہ سوال میرے ذہن میں بھی گردش کرتا رہا۔ ممکن ہے اس کا جواب میں مضمون کے آخر میں آپ کو بتا دوں، لیکن تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے راستہ بھر میں اس سوال

کا جواب تلاش کرتا رہا۔

یہ شخص کیا وہی شخص نہیں ہے جس کی خبر مومن خاں مومن نے اپنے مشہور شعر میں دی تھی۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مجھے یاد آیا وہ زمانہ جب فلمی گیتوں، رومانی ناولوں اور غزلوں کے ڈھیر سے ایک مہین سا ہیولا برآمد ہوا کرتا تھا جیسے تپتی ہوئی زمین پر پہلی بارش کی پہلی بوند پڑتے ہی دلفریب قسم کی خوشبو مشامِ جاں کو روشن کر دیتی ہے۔ اس ہیولے کا سر جھلملاتے معطر آنچل میں روپوش ہوتا۔ میں اپنے ارد گرد بکھری حسین صورتوں میں اس کا چہرہ تلاش کرنے کی ناکام سی کوشش کرتا۔ اس کا چہرہ تلاش کرنے میں میں نے عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ ضائع کر دیا۔ بات آگے بڑھی تو ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی تو محسوس ہوتا رہا کہ میری زندگی کی ویران حویلی میں کوئی سر کٹی لاش گھومتی ہے اور مجھے جھنجھوڑ کر کہہ رہی ہو کہیں سے میرا گمشدہ سر لادو، میرا کھویا ہوا چہرہ لادو۔

ایک مدت تک محسوس ہوتا رہا۔ وہ ہیولا میرے ساتھ چلتا رہا اور پھر وقت کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔

کیا یہ دوسرا ٹکٹ اسی کے لئے تھا؟

میری زندگی کے کسی اسٹیشن پر وہ ہیولا وقت کی بس سے اتر کر چانک غائب ہو گیا۔

کسی اسٹیشن پر بس کے رکتے ہی، میرے ساتھ بیٹھا مسافر بھی اسی ہیولے کی طرح نہ جانے کب اتر گیا تھا۔ تاہم مجھے لگا وہ ہیولا اب بھی اسی بس میں ہے۔ میں نے دیکھا۔ ایک نوجوان بس کی کھلی کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا اور بظاہر باہر بکھرے مناظر میں کھویا ہوا تھا۔ وہ ہیولا اس کے ساتھ تھا۔

ڈبل رول

میرے ساتھ اب بھی ایک شخص ہے یہ میرا سایہ نہیں، شاید میں ہی اس کا سایہ ہوں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اس کا تعاقب کر رہا ہوں ۔ یہ خوبرو، وجیہ، صحتمند اور بارعب شخص ایک مکمل آدمی ہے ۔ میں تو محض اس کی ایک پر چھائیں ہوں۔ یوں تو یہ شخص میرے اندر سے برآمد ہوا ہے تاہم محسوس ہوتا ہے میں اس کے کاندھے پر سوار ہوں۔ وہ نہ ہوتا تو میں ایک قدم بھی نہ چل پاتا۔

بہر حال وہ شخص ایک کامیاب ادیب، بہترین انسان، پرفیکشنسٹ، دولت اور اعلیٰ عہدہ کا مالک، وہ جہاں جاتا ہے، لوگ آنکھیں بچھائے رہتے ہیں۔ اس کے لئے ہر جگہ راستے ہموار ہیں۔ میں اس تک نہیں پہنچ پایا ہوں لیکن مجھے لگتا ہے ایک دن وہ میری روح میں سرایت کر جائے گا۔ میرا جسم اس کا جسم بن جائے گا۔ میں اس کے برابر ہو جاؤں گا۔ جب وہ دن آئے گا وہ غائب ہو جائے گا، میں ہی میں رہوں گا۔ کیا یہ ٹکٹ اس مسٹر غائب کے لئے ہے۔

نہیں اگر ایسا ہوا تو یہاں ہر شخص کو دو ٹکٹ خریدنے پڑیں گے کیونکہ ایسی قد آور شخصیت تو ہر شخص کے ساتھ ہے جس کی پوستین میں گھس کر وہ بڑا کہلانے کی جدوجہد میں مبتلا ہے ۔ وہ ایک خیالی چیز ہے جس کے ساتھ سفر کرنے پر آپ کو ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہیں۔ اس خواب نے ابھی حقیقت کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ مگر میں تو اس خواب کو بھی حقیقت کی طرح مان کر چلتا ہوں، لوگ مانیں نہ مانیں۔ کیا ایسی حماقت کرنے والا اس دنیا میں میں اکیلا ہوں۔ شاید نہیں، شاید کیا یقیناً نہیں۔ یہ خیالی فریب اگر مجھ سے چھین لیا جائے تو ممکن ہے میں جی بھی نہ پاؤں۔ کیا یہ دوسرا ٹکٹ اسی کے لئے ہے؟

میرے کاندھے پر دو فرشتے بیٹھے ہیں۔ کراماً کاتبین میرے ایمان کا حصہ، جن کے لکھے پر میں پکڑا جاؤں گا یا ان کی تحریری گواہی پر چھوٹ پاؤں گا۔ بچوں کا آدھا ٹکٹ لگتا ہے۔ یہ دونوں فرشتے بھی تو بچوں کی طرح معصوم ہیں۔ کیا ان دونوں کا آدھا آدھا

ٹکٹ اس ایک ٹکٹ میں شامل ہے۔آخران کا بھی تو وجود ہے کیاان کا ٹکٹ نہ لیا جائے گا؟ بغیر ٹکٹ سفر کرنا قانوناً جرم ہے، گناہ ہے۔اگر یہ دونوں بغیر ٹکٹ سفر کر رہے ہیں تو ان کا گناہ ان کے نامہ اعمال میں کون لکھے گا؟

معصوم بچوں کی غلطیوں کے ذمہ دار بھی تو والدین ہی ہوا کرتے ہیں ان کے پڑوسی کی کھڑکی کا شیشہ توڑنے پر پڑوسی ان کے ماں باپ ہی سے تولڑنے آتے ہیں۔

ان کا ٹکٹ بھی شاید مجھے ہی خریدنا چاہئے۔کیا یہ ٹکٹ اسی سلسلے کی کڑی ہے؟

میں نے چاہا کی اس ٹکٹ کو کراماً کاتبین کے نام معنون کر دوں۔معاً کنڈکٹر میرے قریب آکر زور سے چیخا۔ٹک دکھایئے۔

دوسرا ٹکٹ کس کا ہے؟ کون ہے؟

بہر حال اب وقت آپہنچا ہے کہ کنڈکٹر کی طرح آپ کو بھی اس سوال کا جواب دے دیا جائے۔بات دراصل یہ ہے کہ کل جب میں بس میں سوار ہوا تھا تو غضب کی بھیڑ تھی۔اس سے پہلے کہ ٹکٹ کاٹنے کے لئے کنڈکٹر میرے پاس آتا،میری منزل آگئی اور لوگوں کے ریلے نے مجھے بس سے باہر دھکیل دیا۔میں ٹکٹ خرید نہیں پایا یہ سرکاری نقصان ہوا۔اس چوری کا احساس میرے ضمیر کو ملامت کرتا رہا۔جب وہ کسی ضدی بچے کی طرح پیر پٹخ پٹخ کر میرے اندر کہرام بر پا کرتا رہا تو میں نے اسے بچوں ہی کی طرح سمجھایا کہ وہ بس چھوٹ گئی تو کیا ہوا اس کا بھی علاج ہے ہمارے پاس سرکاری خزانے میں وہ پیسہ پہنچانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ دو ٹکٹ خرید لئے جائیں۔

زائد ٹکٹ خرید کر میرا ذہن ایک نئے سفر پر چل پڑا۔ایک ٹکٹ میں دو مزے اسی کا نام ہے۔میں اپنے حال ماضی اور مستقبل کی سیر کر آیا۔اس نادیدہ شخص کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔وہ تو نہ مل سکا۔مگر یہ احساس ضرور ہوا کہ میں نے زندگی کے سفر میں نہ جانے کتنے لوگوں کو کھویا،انھیں کھو کر ٹوٹ سا گیا۔پھر ایک نئے انداز میں بنا۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

بھئی جلدی بولو، یہ دوسرا ٹکٹ کس کے لئے ہے؟ کنڈکٹر احتساب پر اتر آیا تھا۔

جب سفر شروع ہوا تو وہ میرے ساتھ تھا۔ راستے میں اتر گیا۔

اپنی منزل پر اترتے ہوئے خیال آیا، کہیں میں نے غلط بیانی سے کام تو نہیں لیا؟

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اپنے آپ کو ڈھونڈا اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔

ششماہی خرمن انٹرنیشنل ۲۰۱۵

ڈانٹ

بچپن کو کسی نے جنتِ گمشدہ کہا ہے۔ یہ اطلاع ہم تک چھٹپن میں نہیں پہنچی تھی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں ہمیں اس وقت کا شدّت سے انتظار رہتا تھا جب ہمارا بچپن کسی اکنی کی طرح اچانک کھو جائے، اس لئے کہ وہ اس وقت ہمارے لئے اکنّی ہی کی طرح بے قیمت تھا۔ ہم دل و جان سے یہ چاہتے تھے کہ بچپن کے اس قید خانے سے نکل بھاگیں اور آناً فاناً بڑے آدمی بن کر مستقبل کے سنہرے تخت پر براجمان ہو جائیں، کیونکہ ہماری جنت بڑا بن جانے ہی میں پوشیدہ تھی۔ ایسا کیوں تھا اس کا بیان آگے آئے گا، مگر آج ہم اس مستقبل کے محل یعنی فی الحال کے زنداں میں پہنچ کر سوچتے ہیں کہ اگر بڑا بن جانا ہی جنت ہے تو یقیناً احمقوں کی جنت ہوگی، جن کی آج بھی کوئی کمی نہیں۔ یہ نامراد طبقہ عظیم بن جانے کی خیالی جنت میں سانس لیتا ہے اور حسد و رقابت کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔

اب آئیے اس سوال پر کہ آخر ہمیں بچپن کی ان آسودہ فضاؤں سے نکل بھاگنے کی کیوں سوجھی؟ جواب یہ ہے کہ یوں تو اس دنیا کی ہر شے لاجواب تھی، سوائے ایک ڈانٹ کے جو ہر فرد کی نوکِ زباں پر اس طرح ٹنگی رہتی تھی جیسے کھونٹیوں پر ٹوپیاں ہوا کرتی ہیں۔ ڈانٹ اور گھڑکیوں کی یہ ننھی منی ٹوپیاں ہمارے ہی چھوٹے چھوٹے سروں پر فٹ

بیٹھتی تھیں لہٰذا یہ خراجِ عقیدت ہمیں دن بھر میں کئی بار پیش کیا جاتا تھا۔اس ڈانٹ پھٹکار نے جنتِ ارضی کا سارا سکون درہم برہم کر دیا تھا۔ گویا اس کا جنت پن ہی ختم ہو گیا تھا۔ جس طرح شجرِ ممنوعہ کو چکھتے ہی حضرتِ آدمؑ کو خداوند عالم کی ڈانٹ سننی پڑی تھی، بس پھر کیا تھا۔اس کے بعد وہ بھری پری جنت جنت نہ رہی۔

والدین کا خیال ہے کہ بچوں کو ڈانٹنا ان کا پیدائشی حق ہے اور ڈانٹ بچوں کی پیدائشی سزا ہے۔ خدا جانے یہ لوگ اپنا حق وصول کرتے ہیں، فرض ادا کرتے ہیں یا بچپن میں ان کے ساتھ ہوئے مظالم کا حساب برابر کرتے ہیں۔جس قسم کی زندگی ہم آپ گزار رہے ہیں اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ زندگی بذاتِ خود ایک ڈانٹ ہے۔ بلکہ موت بھی اسی قسم کیا ایک واقعہ ہے۔ جیسے کسی نے ہمارے ہاتھ سے کارِ جہاں چھین لیا اور یہ کہہ کر چلتا کر دیا کہ چل بھاگ نکلے یہ تیرے بس کا روگ نہیں۔

ڈانٹ کبھی زندگی بن کر ہم پر برستی ہے اور کبھی موت بن کر ٹوٹ پڑتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ڈانٹ سننے کے بعد ہمارے اندر جوز بردست قسم کی جھنجھناہٹ سر سے پیر تک پیدا ہوتی ہے اس کے نتیجے میں ہمارا قبلہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ گویا ایک نئی راہ بلکہ نئی زندگی عطا کر دی جاتی ہے کہ یہ دو آتشہ دونوں کام آئے گی۔

ڈانٹ دراصل ایک آئینہ ہے جس میں ہم پر عائد کی گئی پابندیوں کا چہرہ نمایاں ہے۔ڈانٹ کے اسی آئینے میں ڈانٹنے والے کی شبیہ بھی موجود ہے۔اسے اپنا قد آپ سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ڈانٹنے والا اپنے قد و قامت کی دلربائی سے آپ کو مسحور کر دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ ڈانٹ کو نامہ بر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ڈانٹ اگر واقعی کسی منصف کے بیان کی طرح معتبر اور غیر جانبدار ہوتی تو گاہے بگاہے ماتحتوں کو بھی اپنے اعلیٰ افسران پر گرجتے برستے دیکھا جا سکتا تھا۔لیکن ڈانٹ اقتدار کی لونڈی ہے اور اس پر اعلیٰ طبقہ کی اجارہ داری ہے۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

اگر آپ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ڈانٹ ہمیشہ غلطی کے سرزد ہونے پر ہی پڑتی ہے تو آپ سراسر غلطی پر ہیں۔ ہمیں آپ کے افسرِ اعلیٰ ہونے کا شرف حاصل نہیں ورنہ آپ کو ڈانٹ پلانے کا یہ سنہری موقع ہم کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

ہر بڑا شخص یا ادارہ جو اپنی بڑائی کسی پر تھوپنا چاہتا ہے ڈانٹ کو ایجنٹ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے عتاب اور انانیت سے بچنے کے لئے احتیاط، باقاعدگی اور مستعدی کو آپ ڈھال کے طور پر ہی استعمال کیوں نہ کرلیں، وہ ایسے مواقع ضرور ڈھونڈ نکالے گا جب ادارہ کا مفاد، نظم وضبط یا امنِ عامہ کے لئے ڈانٹنا اس کے فرائضِ منصبی میں شامل ہوجاتا ہے۔ اس موقع پر عقلمند لوگ اپنا کام کرجاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ افسرِ اعلیٰ ڈانٹ کے روپ میں اپنی برتری کا اعلان کرے وہ خوشامد کی شکل میں اس کی جھوٹی عظمت کا اعتراف کرلیتے ہیں۔ اور فوراً اس کی تاج پوشی کرکے اس کے عتاب کا نشانہ اپنے کسی ساتھی کو بنا کر ایک ٹکٹ میں دو مزے لوٹتے ہیں۔

جب کبھی میں گھر میں اپنے بچوں کو ڈانٹتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے گویا میں تھرمس میں گرم چائے بھرنے سے پہلے ہلکا گرم پانی انڈیل رہا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں میرے بچے اس شوگر کوٹیڈ گولی کو ہضم کرلیں گے ورنہ، میں سوچتا ہوں، جب وہ گھر سے باہر نکل کر اپنے ہی آنگن میں لگے آم کے پیڑ پر پتھر اچھالیں گے تو پڑوسی کی زہر ناک ڈانٹ کا مقابلہ کیسے کرپائیں گے جس کے لہجے کی سفاکی ان کے لئے اجنبی ہے۔ وہ حیران ہوں گے کہ اتنی ذراسی بات پر پڑوسی اسقدر غضبناک کیوں ہے؟ وہ نہیں سمجھیں گے کہ 'کھڑکیوں میں لگے ہمارے شیشے ٹوٹ جائیں گے' جیسے معمولی جملے میں پیڑ پر جھولتے ہوئے آموں کو دیکھ کر اندر ہی اندر ابلنے والا جوالامکھی چھپا ہوا ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں بچّے آسان ڈانٹ سے مشکل ڈانٹ کی طرف جائیں۔ وہ ڈانٹ کے اندر چھپے سچ اور جھوٹ کو دریافت کریں۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

جھوٹی ڈانٹ وہ ہوتی ہے جس میں ڈانٹنے والے کا جذبہ اصلی اور متعصّبانہ ہوا کرتا ہے مگر الفاظ منافقانہ ہوتے ہیں۔ ایسی ڈانٹ کا انداز کہہ مکرنیوں کا ہوتا ہے۔

سب یہی کہتے ہیں کہ ایسا کام نہ کرو جس پر کسی کی ڈانٹ سننی پڑے۔ میں سوچتا ہوں، کیا یہ ممکن ہے؟

کام بھلا ہو یا برا اس پر کچھ لوگ خوش ہوں گے اور کچھ اس میں عیب نکال کر آپ کو ڈانٹ پلانے کا موقع تلاش کریں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈانٹ کے درمیانی اسٹیشنوں سے گزرے بغیر منزل تک پہنچنا ذرا دشوار ہے۔ آپ نیک کام کرنے کے لئے آگے بڑھیں، تب بھی راستہ یہی اختیار کرنا ہوگا۔ طلسمی کہانیوں کے شہزادے کی طرح پیچھا کرتی ہوئی شیطانی چیخوں اور ڈانٹ پھٹکار کی کان پڑی آوازوں پر ہم دھیان نہ دیں اور آگے بڑھتے جائیں، ورنہ پتھر کے نصف آدمی بن جانے کا خطرہ ہے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ڈانٹ امن اور جنگ کے درمیان ایک Buffer State کی حیثیت رکھتی ہے۔ نہ یہ مکمل اندھیرا ہے نہ مکمل اجالا۔ یہ ایک لکیر ہے جو اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتی ہے۔ یہی حال دھمکی کا بھی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دھمکی یا تو جنگ کا آغاز ثابت ہوتی ہے یا اختتام۔ اس کے برعکس ڈانٹ ایک موڑ ہے جہاں سے راستے تاریکی اور بے معنویت کے چیتھڑے اتار پھینکتے ہیں اور معنویت کے چمچماتے ہوئے نئے لباس سے آراستہ ہو کر منزل کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔

ماہنامہ اوراق، لاہور

چوہوں سے نجات کی خاطر

گزشتہ رات میری آنکھ کھلی تو دیکھا، سرہانے وہی کتاب رکھی تھی جس کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں مراقبے میں چلا گیا تھا۔حسبِ روایت میں بھی تصوف کے موضوع پر لکھی اس کتاب میں اپنی بے خوابی کا علاج تلاش کر رہا تھا، چنانچہ اب وہاں ایک موٹا سا چوہا اپنے تیز دانتوں سے نقب زنی میں مصروف تھا، اپنی نسلی روایات کے مطابق میری بے خوابی کا سامان مہیا کر رہا تھا۔اور کتاب کا حال پانی پت کی طرح پائمال تھا گویا چوہا تصوف کو کتابی قلعے سے آزاد کر کے ہی دم لے گا۔اب وہ مجھے اس انداز سے گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو جنابِ عالی! آپ نے اسے فقط چکھ کر چھوڑ دیا، یہ کتاب تو بقول بیکن ہضم کرنے کے لائق تھی۔

زندگی کی کتنی ہی فلسفیانہ توجیہات چوہوں کی زندگی اور موت سے وابستہ کی جا سکتی ہیں، یہ اور بات کہ ہم اس حقیر سی مخلوق کے ساتھ ہمیشہ ہی لاپرواہی برتتے رہے ہیں۔ ہمارے سماج نے لاپرواہی تو ان لوگوں کے ساتھ بھی روا رکھی ہے جو چوہوں کی طرح ڈرپوک ہوتے ہیں۔ہمارے ادب میں رائج ان چند مثالوں کو تو استثناء ہی سمجھنا چاہئے جن میں کہیں ایک عدد چوہے کو نکالنے کے لئے پہاڑ کھودنا پڑتا ہے اور کہیں بلی کے فریضہ حج

کے لئے نوسو چوہوں کی خوراک لازمی سمجھی جاتی ہے۔مجموعی طور چوہے یا تو انسانوں کی عدم توجہی یا بلیوں کے شکار رہے ہیں۔بلیاں ابتدا ہی سے چوہوں کی جانب مائل رہی ہیں۔ان کے اس التفاتِ بے جا کو ٹالنے کی غرض سے چوہے ان ستم شعار بلیوں کی گر دنوں میں گھنٹیاں باندھنے کے منصوبے باندھتے رہے ہیں۔البتہ انسانوں کے خلاف چوہوں نے ایک احتجاجی مہم چھیڑ رکھی ہے۔صدیاں گزر گئیں،ترسیل وابلاغ کی بے پناہ ترقی کے باوجود انسان آج بھی ان چوہوں کا عندیہ سمجھنے سے قاصر ہے۔

انسانی زندگی کو فارمولا کی زبان میں مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے

خوردونوش + ضروریاتِ زندگی + بقدرِ ظرف عیش + وغیرہ

اس کے برعکس چوہوں کی زندگی کھانے اور سانس لینے سے عبارت ہے۔رہی دھما چوکڑی تو وہ محض خون گرم رکھنے کا بہانا ہے۔چوہوں کا احتجاجی پلیٹ فارم ان کا دستر خوان ہی ہے جو ہند تا بہ ارضِ کاشغر پھیلا ہوا ہے۔چوہوں اور انسانوں میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ابنِ آدم کھانے سے پہلے یا بعد میں تباہی پھیلاتا ہے جبکہ چوہوں نے غارت گری کے اس عمل کو تناولِ طعام کے ساتھ ملا رکھا ہے۔کم کھاؤ برباد زیادہ کرو،یہی ان کا طرزِ احتجاج ہے گویا غارت گری متن ہے اور احتجاج نفسِ مضمون!

کوئی جدت پسند چوہا آپ کی قمیص میں ننھا سا شگاف پیدا کردے یا مشاعرہ باز شاعر گھسی پٹی زمین میں شعر کہہ دے تو چوہا اور شاعر دونوں زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں،توجہ چاہتا ہوں۔یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ کس کے ہنر کی داد دی جائے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چوہے نے قمیص کے دامن میں ایک خوبصورت سا شعر سجا دیا ہے اور شاعر نے ادب میں رخنہ ڈال دیا ہے۔

گزشتہ دنوں چوہوں کی ایک چھاپہ مار ٹولی نے میرے کمرے میں جو قیامتِ صغریٰ برپا کی اسے دیکھ کر میرا جی چاہا کہ چوہوں کی خدمت میں یہ عرض کروں کہ اے

شب زندہ دارو! بھوک لگی تھی تو سائل کی طرح سوال کرتے، دو چار کا وفد روانہ کرتے۔ اتنی توفیق نہ ہوتی تو دھرنا دے کر بیٹھ جاتے کہ بہر حال جمہوری قدروں کا پاس ان تمام جانداروں پر لازم ہے جو جمہوریت کے سائے میں سانس لے رہے ہوں۔ پھر یہ کہ جمہوری حکومتیں انسانوں اور جانوروں کے درمیان تفریق روا نہیں رکھتیں۔ ان کی نظر میں انسان اور حیوان دونوں برابر ہیں۔ (ثبوت اس کا یہ ہے کہ یہاں انسانوں کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے جو جانوروں کے شایانِ شان ہے) اور اگر میرے کمرے کو مفتوحہ علاقہ تصور کر لیا تھا اور پرائے مال پر ہاتھ صاف کرنے میں جو لذت پوشیدہ ہے اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے تو کسی ایک کتاب یا فائل کا انتخاب کرتے اور اسے شروع سے آخر تک کترتے چلے جاتے۔ مگر آپ ٹھہرے دنیا بھر کے ہرجائی ہر چیز پر منہ مارتے پھرے۔ چوہوں کی چشمِ ہوس ہر رنگ اور منظر سے سرفراز ہوتی رہی۔

چوہوں کی فتنہ پردازیاں اس وقت قابلِ دید ہوتی ہیں جب گیہوں کی فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ اس کے سنہرے خوشے فضا میں لہرانے لگتے ہیں۔ چوہے بجائے اس کے کہ کھیت کی مٹیالی پلیٹ میں سجی گندم کی فصل ایک سرے سے کھائیں، وہ ہر بالی کو درمیان سے کتر کتر کر بطور سامانِ عبرت چھوڑ جاتے ہیں۔ دس فیصد فصل کو نوالہ بنائے بغیر چوہے پورے کھیت کو برباد کر ڈالتے ہیں۔ آخر اس میں کیا راز ہے؟

طبی لحاظ سے آنکھوں کا دانتوں سے گہرا رشتہ سہی مگر دونوں کی لطف اندوزی کے میدان علیٰحدہ ہیں۔ مجھے نہیں معلوم چوہوں کو رنگوں کی پہچان ہے یا نہیں لیکن ان کا چٹورا پن اور رنگین مزاجی انھیں محض رنگوں سے آنکھیں روشن کر لینے تک محدود نہیں رکھتی بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دانتوں کی مدد سے رنگوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتے ہیں۔ آنکھ لذت کی سطح تک محدود رہ کر اپنا رزق حاصل کرتی ہے۔ چوہے دانتوں کے وسیلے سے لذائذِ ارضی تک پہنچتے ہیں۔ جب کہ لذتوں کے جہانِ دیگر بھی ہیں جن کے لئے اور

طرح کے دانت درکار ہیں۔ مثلاً میری سوچ، ذوق، احساس، ضمیر وغیرہ بھی تو ایک قسم کے دانت ہی ہیں۔ بعض انسانوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ دودھ کے دانت گرنے کے بعد مذکورہ دانت آتے ہی نہیں۔ اس صورت میں وہ بے حسی، بے ضمیری کے ساتھ جیتے ہیں اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ غیروں سے مانگی ہوئی سوچ احساس اور آدرش کی نقلی بتیسیاں لگا کر ہم اپنوں پر وہی نقلی دانت نکال نکال کر ہنستے ہیں۔ چوہے محض دانت دکھا کر حاصل ہونے والی لذتوں سے محروم ہیں۔

چوہوں کو دیکھ کر بے اختیار یاجوج ماجوج یاد آ جاتے ہیں ان میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ چوہے اور یاجوج ماجوج دونوں ہی تباہی و غارت گری کے پیغامبر ہیں۔ جس طرح یاجوج ماجوج سدِ سکندری کو آدھا چاٹ کر چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح چوہے بھی جس چیز کو کترنا شروع کریں اس کی دوسری انتہا تک شاذ ہی پہنچ پاتے ہیں، چلئے اس سے کم از کم اتنا تو ثابت ہو گیا کہ چوہے انتہا پسند نہیں ہوتے۔

تصوف کی کتاب اسی طرح رکھی تھی۔ اس پر بیٹھا چوہا مجھے اسی طرح گھور رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں جہالت، درندگی اور سفاکی کی نمائندہ اور اس کے روبرو میں انسانیت کا علمبردار! ابنِ آدم، جو صدیوں سے جہالت کی سدِ سکندری کو چاٹ رہا ہے اور ایک متمدن دنیا کا باشندہ ہونے پر فخر کرتا ہے۔ ایک طرف وہ چوہا تھا جو شیکسپیر کی کسی کتاب پر دانت تیز کرنا شروع کرے تو صفحات کے درمیان محض ایک شگاف یا ادھوری سی سرنگ بنا کر رکھ دے اسی کاغذ ی دیوار کی دوسری جانب موجود معنی و مفہوم کے اس جہانِ دیگر تک اس کی رسائی نہیں جس نے شکسپیر کو عالمی ادب میں ایک منفرد مقام عطا کیا۔ اور دوسری جانب رومی اقبالؔ، شکسپیر، ٹالسٹائی وغیرہ کو اپنی بغل میں داب کر ساری دنیا میں اودھم مچاتا ہوا انسان!

بھلا اس جاہلِ مطلق چوہے سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی غارت گری کی یہ دیرینہ

محمد اسد اللہ

ڈبل رول

عادت ترک کر کے نظم وضبط اختیار کرے کہاں تک مناسب ہے؟

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، ٹی وی، فرج، موٹر کار، شاندار فلیٹ راحت و آرام کی مادی دنیا مجھے چاروں جانب سے سدِّ سکندری کی طرح گھیرے ہوئے ہے۔ میں اسے تھوڑی دور تک چاٹ چاٹ کر ارضی اور عارضی لذتوں میں گم، بے حسی کی اندھیری رات میں کان لپیٹ کر سویا ہوں۔ حالانکہ اگر اس دیوار کو مزید چاٹ کر دوسرے کنارے تک پہنچ جاؤں تو مجھے آفاقی لذتوں کا جہانِ نو دستیاب ہو۔ میں بھی تصوف کی کتاب پر براجمان چوہا ہوں جس سے کتاب کا رشتہ محض لذتِ کام و دہن کا ہے۔ راہِ سلوک کی لذّتیں اب بھی اندھیرے میں گم ہیں۔

مجھے محسوس ہوا جیسے میں آدمی نہیں۔ ایک بہت بڑا مکان ہوں جس میں کئی کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہیں اور درمیان میں میرا دل نہیں مٹی کی دیوار میں بنا ہوا ایک بل ہے جس میں خواہشات کے چوہے ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ سلیقے اور نظم وضبط کے ساتھ زندگی گزاری جائے تو جتنا رزق اس زمین پر پھیلا ہوا ہے بنی نوع انسان اور تمام مخلوقات کے لئے کافی ہے مگر میرے اندر موجود یہ خواہشات کے چوہے اپنے تھوڑے سے چٹخارے کے لئے کرہ ارض کو الٹ پلٹ کر رکھ دینے کو ہی زندگی کا اصل سکھ سمجھے ہوئے ہیں۔ تباہی، غارت گری اور افراتفری کی شاہراہوں پر آگے بڑھنے والا دو پاؤں والا انسان، چار پاؤں اور ایک دم والے چوہے سے یہ مطالبہ کیوں کرے کہ وہ اس سے آگے نہ جائے۔

چوہے کی آنکھوں میں شاید یہی سوال تھا۔ عجب لاجواب چوہا تھا۔ مجھے بھی لاجواب کر گیا۔

ماہنامہ اوراق، لاہور
ماہنامہ شگوفہ۔ حیدرآباد، سالنامہ ۲۰۰۰

عید

یوں تو عید کے لفظی معنی ہی خوشی کے ہیں لیکن جب زندگی ہی سے معنویت رخصت ہو جائے تو خوشی بھی محض لفظی بلکہ لفاظی ہو کر رہ جاتی ہے۔ایسی صورت میں ملاقات کے دوران ادا کیا جانے والا یہ مروّجہ فقرہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی کہنے والے اور سننے والے دونوں کے اندر سے خالی برتن کی طرح ٹھن ٹھن بجتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ایسے ہی کسی موقع پر شاعر نے کہا ہوگا : ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے۔

قومی المیہ اور اجتماعی غم ایک دوسرے کے حساب میں لکھے جاتے ہیں،اس کے باوجود الگ الگ چیزیں ہیں ۔ہمیں اپنے غم میں دبلے ہونے سے فرصت ملے تو اندیشہ شہر میں بھی مبتلا ہوں۔اس دوسری سرنگ میں داخل ہونے کی نوبت آج کل کم ہی لوگوں کو آتی ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ جسے غم کھانے کی عادت سی پڑ گئی ہو اس کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں غموں کی چھوٹی بڑی ڈشیں رکھی ہوئی ہیں۔رب العالمین نے ایسے لوگوں کے لئے لذّتِ کام و دہن کا معقول انتظام کر رکھا ہے ۔وہ حضرات جو غم خواری کے معاملہ میں خوش خوراک واقع ہوئے ہیں قاضیِ شہر ہوں نہ ہوں،ڈائٹنگ کئے بغیر ہی دبلے ضرور ہوتے ہیں۔اور لگاتار دبلے ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ زمانے میں قاضیِ شہر ہونا دبلے پن کا سبب بیان کیا جاتا تھا، یہ حقیقت یا

مفروضہ جو بھی تھا، اب محض محاوروں تک محدود ہے ۔ اب تو عام طور پر قاضی شہر نہ ہونا دبلے پن کا اصل سبب ہوا کرتا ہے ۔ کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا، جیسے مصرع کو اب متروک سمجھنا چاہئے کہ فی زمانہ عقل مند لوگ ڈبل روٹی کھا کر خوشی سے پھولنے میں یقین کھو بیٹھے ہیں ۔ ہاں، کسی کے منہ سے روٹی چھین کر خوش ہونے کی سعادت یا عادت عام ہے ۔

ہمارے دوست مسٹر مان غم نصیبوں میں ہیں جو خوشیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں ۔ بقول ان کے، احباب کی فتح کی خوشی میں ان کا بھی شیئر Share ہے ۔ ایسے ہی ایک شیئر ہولڈر کا قول ہے کہ نہ میرے دشمنوں کی ناکامی پر مجھے انتقامی خوشی ہوتی ہے نہ کسی کی کامیابی میرے لئے مسرت افزا ہے ۔

پھر آپ کو خوشی کب ہوتی ہے؟ ہم نے ان سے پوچھا۔

کہنے لگے: یہ بھی ایک راز ہے ۔ دراصل ان دنوں، کامیابی کی زیادہ تر خبریں بناسپتی ہوا کرتی ہیں ۔ ان میں وہ لذّت ہی نہیں، جیسے آجکل مرغی کے انڈوں میں وہ بات نہیں جو ہمارے بچپن میں گھر کی مرغی کے انڈوں میں پائی جاتی تھی ۔ میاں تم تو پولٹری فارم کی مرغیوں کے انڈے کھا کر بڑے ہوئے ہو، تمہیں کیسے سمجھائیں؟

اب یہی لے لو پڑوس کے شیخ صاحب کے لڑکے کا نام میرٹ لسٹ میں آیا ہے ۔ اسے اس مقام تک پہنچانے میں شیخ صاحب نے جو آسمان کے تارے توڑے ہیں، ہمیں سب پتہ ہے ۔ اس خبر پر خوش ہونے کا میں صرف مظاہرہ ہی کر سکتا ہوں، خوش نہیں ہو سکتا۔

مجھے یاد ہے ہمارے بچپن میں عید کی خوشیاں سیوئیوں اور شیر خورمے کی پیالیوں میں بھر بھر کر آیا کرتی تھیں ۔ نئے نئے کپڑوں میں مہکا کرتیں، کسی کی پھول دار گول گول ٹوپی میں جھلمل چمکتی تھیں، کبھی یہ خوشیاں عیدی کے سکوں میں کھنکھناتیں اور اس دن لگے مینا بازار میں بکنے والی سیٹیوں اور باجوں سے ابھرتے ہوئے سات سروں میں گایا کرتی تھیں ۔

پھر ہم ذرا بڑے ہوئے ۔ دودھ کے دانت گرتے ہی ہم ان معصوم سی خوشیوں

سے محروم ہو گئے۔جب قد و قامت نے پر پرزے نکالے تو زاویہ نظر اور آس پاس بکھری ہوئی دنیا کے ساتھ ساتھ خوشیوں کے بہانے بھی بدل گئے۔

میرا ایک بچپن کا ساتھی ج یہ کہا کرتا تھا کہ رشتہ داروں کے گھر جا کر شیر خورمہ کھانے ہی میں اسے عید کا اصل لطف آتا ہے۔یہ لطیف نکتہ بہت بعد میں ہماری سمجھ میں آیا کہ انہی عزیزوں میں سے کسی کے گھر اس کی بات پکّی ہوئی تھی۔گویا خوشی شیر خورمے کی پیالیوں سے نکل کر شربتِ دیدار سے بھرے ایک جام میں آ گئی تھی۔پھر کچھ وقت اور گزر گیا۔اب مسٹر ج عید پر بھی ان عزیزوں کے گھر نہیں جاتا۔بات دراصل یہ تھی کے لڑکی والے نکاح سے پہلے مسٹر ج کو برسرِ روزگار دیکھنا چاہتے تھے اور وہ پڑھ لکھ کر نوکری کی تلاش میں مدتوں جوتیاں چٹخاتا رہا۔ادھر کوئی کاروالا آیا اور اس کی چاہت کو بیاہ کر لے گیا۔آخر میاں مجنوں نے تھک ہار کر موٹر میکینک کا کام اپنا لیا۔اب وہ وصالِ یار کی خوشی سے ہاتھ دھو چکا ہے۔اس کی قسمت کی سیاہی آئل بن کر اکثر اس کے ہاتھوں سے چمٹی رہتی ہے۔وقت گزرا تو شادی بھی کر لی لیکن بقول م حقیقی خوشی والی ڈش اس کے حصّے میں نہ آنی تھی نہ آئی۔بات دراصل یہ ہے کہ دودھ کے دانت گرنے کے بعد خوشیوں کے الگ الگ رنگوں سے لطف اندوز ہونے کا کام ہم جاری رکھتے ہیں۔یہ نہ ہو تو زندگی کسی سیاسی لیڈر کی تقریر کی طرح بیزار کن ہو کر رہ جائے۔

اب عید پر ہمارے بچّے جب نئے نئے کپڑوں،عیدی اور شیر خورمے کی مزید ایک پیالی کا مطالبہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے اپنی اوریجنل بتّیسی نکال کر رکھ دی ہے۔(حالانکہ یہ ممکن نہیں)اور اس کی جگہ بچّوں کے دودھ کے دانت فٹ کر لئے ہیں۔ان دانتوں میں دبی کھجور یعنی خوشی دھیرے دھیرے اپنا رس چھوڑتی جا رہی ہے اور اس کی شیرینی کا دریا رگوں میں پھیلتے پھیلتے دل کے ساحل پر شوخ لہروں پر دستکیں دے رہا ہے۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

ماہنامہ اوراق، لاہور

انتظار

انتظار وہ لاجواب سی کیفیت ہے جس میں ہم سوالی کی طرح آنے والے کی راہ تکتے نہیں تھکتے، تھک کر بیٹھ بھی جائیں تو انتظار ندی کی طرح دھیرے دھیرے بہتا رہتا ہے۔ البتّہ ہم تھک کر ہار جائیں تو پھر کیسا اور کس کا انتظار۔ انتظار، دراصل ایک سوال ہے جو اپنے جواب سے بچھڑ گیا ہے۔ ان دونوں کا ملن ہو جائے تو انتظار انتظار نہیں رہتا، جیسے ایک پیاسی ندی سمندر کے وجود میں گم ہو گئی ہو۔

انتظار رحمت ہے یا زحمت؟ اس سوال کے جواب کا انتظار کرنے سے پہلے آئیے ذرا سوچ لیں کہ انتظار نہ ہوتا تو اس درمیانی وقفہ میں ہم کیا کرتے؟ ظاہر ہے کوئی ایسا کام تو ہرگز نہ کرتے جس سے ملک و قوم کا نام روشن ہو۔ اور یوں بھی اچھے دنوں کے انتظار نے ہمیں اس قابل رکھا ہی کہاں ہے کہ اپنے برے دنوں کو مزید خراب کریں۔ انتظار کا وجود نہ ہوتا تب بھی ہم وہی کرتے جواب کرتے ہیں، یعنی اسے انتظار کا نام دیئے بغیر۔۔۔

کسی چیز کا کوئی بھلا سا نام مقرّر ہو جائے تو اس کے ساتھ ڈھیر سی امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ وہ عجیب و غریب سی صورتِ حال جب ہم بہت کرتے ہوئے بھی کچھ

نہ کر پانے کی کیفیت میں گرفتار ہوں، اسی کا دوسرا نام انتظار ہے یہ وہ عجیب وغریب حالت ہے جب ہم جس چیز کا انتظار کرتے ہیں وہ جس قدر دور ہوتی ہے اتنی ہی قریب معلوم ہوتی ہے۔ جہاں کوئی راستہ نہیں جاتا، احساس اپنی راہیں خود بنا لیتا ہے۔ اگر محبوبہ کے دلکش سراپے نے ہمیں سراپا انتظار بنا کر کہیں نصب کر رکھا ہے تو عالم یہ ہے کہ محبوب خیالوں کی گلی میں دس پھیرے لگا چکا ہے۔ یہی انتظار اگر بس کا ہے تو دور دور تک ہماری منزل تک جانے والی بس کا نام ونشان نہیں اس کے باوجود ہر آتی جاتی بس ہماری مطلوبہ سواری بن کر دل و دماغ کے راستوں پر گرد و غبار کا بادل چھوڑ جاتی ہے۔ انتظار ہو رہا ہے تنخواہ کا اور کائنات کی ہر شے تنخواہ میں ڈھل گئی ہے۔ تنخواہ رک جائے تو بیوی کے چہرے پر پھیلتی مسکراہٹ میں بھی بریک لگ جاتے ہیں

آرزو اور انتظار کے دو کھلونوں سے چار دن کھیلنے کا نام ہی زندگی ہے۔ خواہشیں تو ہزار ہیں, دھوپ چھاؤں کی طرح آتی جاتی ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہمارے ساتھ بیٹھے مسافر کی طرح کوئی آرزو کب، بس کے درمیانی اسٹیشن پر رکتے ہی، اتر گئی اور اس کی جگہ کب کوئی دوسری خواہش آ کر براجمان ہو گئی۔ انتظار وفا شعار دوست ہے ہر اچھے برے وقت ہمارے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اس سے ہماری دوستی بہت پرانی ہے۔ جب ہم اس دنیا میں نہیں آئے تھے، ہمارے انتظار میں ایک چراغ جلتا رہا۔ عزیزوں کے ذہن میں ایک نامحترم سا سوال گھومتا رہا کہ اس دنیا میں آنے کے بعد ہم محترم کہلائیں گے یا محترمہ؟ جب ہم تکلف برطرف کہہ کر اس اس انتظار گاہِ عالم میں وارد ہو گئے تو اس ایک چراغ سے انتظار کے کئی چراغ روشن ہو گئے۔ آج بھی بوتل وہی ہے انتظار کی شراب بدلتی رہتی ہے، قیامت بھی اس انتظار کے نشے کو ہرن کرنے سے قاصر ہے۔

صبح ہو گئی تو کسی سہانی شام کا انتظار۔ بجھی بجھی سی شام ڈھل گئی تو صبح کا اور سویرا ہوتے ہی دودھ والے، سبزی والے، اخبار والے، گیس سلنڈر والے کی راہ تکنا۔ انڈوں سے

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

چوزوں کے نکل آنے کی امید سے لے کر مرغی کے دستر خوان پر سجائے جانے تک انتظار کی ایک طویل راہ داری ہے۔ دودھ کے دانت گرنے سے عقل داڑھ کے آنے تک کا انتظار اور پھر عقل کے آنے کی موہوم سی امید۔

نوجوانی کی دہلیز پر ہمیں مونچھ اور داڑھی کا بڑا ارمان تھا۔ اسی کمبخت انتظار نے آخر ایک دن حجام کی دکان میں لگی گیسو دراز قسم کی کیو میں کھڑا کر دیا کہ میاں اب کرو اس کے ختم ہونے کا انتظار۔

انتظار کی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام راستے بند کر کے ہمارے سامنے صرف سوچ کا راستہ کھلا چھوڑتا ہے، جہاں آویزاں 'یہ عام راستہ نہیں ہے'، اس بورڈ کے باوجود جا نکاہ اندیشے ہیں کہ چلے آرہے ہیں۔ انھیں کوئی روکنے والا نہیں۔ انتظار جب شباب پر ہو تو آپ ایک بے بس تماشائی کی طرح سوچ سوچ کر جھنجھلاتے ہیں اور جھنجھلا جھنجھلا کر سوچتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں پاتے۔ انتظار آپ کی اس بے بسی پر مسکراتا ہے اور مارے خوشی کے تھوڑا سا اور پھیل جاتا ہے۔

کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے گویا ملاقات ایک قرض ہے اور انتظار اس کا سود ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب سود بھی قرض کا حصّہ بن جاتا ہے۔ اور انتظار ملاقات کا شاخسانہ ثابت ہوتا ہے۔ انتظار زندگی کی طرح مختصر ہو تو دلکش ہو جاتا ہے یا کم از کم اتنا تو ہو کہ ہم جس کے انتظار میں مرے جا رہے ہیں وہ ہمیں زندگی کی طرح پیارا ہو۔ جو یوں ہو تو ہم قیامت تک بھی انتظار کر لیں گے۔ قیامت کا انتظار!

رزلٹ، نوکری، شادی، پروموشن، وغیرہ غیر رومانوی انتظار رومانی ناولوں کی طرح طویل اور ضخیم ہونے کے باوجود کربناک بھی ہوا کرتے ہیں۔ انتظار تو ایک شوگر کوٹیڈ گولی ہے، جس کی شیرینی تلخیوں کا پہلا زینہ ہے۔ انتظار کرنے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں البتہ قیامت کا انتظار کرنے والے یا تو قبروں میں آرام فرما ہوتے ہیں یا بس

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

اسٹینڈ پر بے آرام ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ سٹی بس بھی اب قیامتِ صغریٰ سے کم نہیں مرحومین کو تو موت آتی ہے پر نہیں آتی کی جھنجھٹ سے نجات مل چکی ہے مگر مسافروں کا یہ نصیب کہاں؟

ان میں سے بعض لوگ انتظار کے کرب، یا بوریت کی ضرب سے بچنے کی خاطر خود کو کئی جگہ تقسیم کر دیتے ہیں۔ مثلاً اخبار کھول کر ساری دنیا میں جھانک لیا، سٹی بس کے فرسودہ نظام کے نام دو چار گالیاں اور آٹھ دس جماہیاں نشر کر دیں۔ ریڑھی والے کی بے مزہ چائے صبر کے گھونٹ کی طرح پی لی اور اسی کے قریب کھڑے پان ٹھیلے والے سے پان خریدا، اسے دھوکے کی طرح کھا کر اس واہیات نظام پر تھوک دیا۔ تس پر بھی بس نہ آئی یعنی بس نہ چلا تو گھر اور دفتر کے معاملات کو ادھیڑنا شروع کر دیا، کہیں کوئی خاتون اپنے بیگ سے سوئیٹر نکال کر بننے لگی۔ ان تمام دقیانوسی مصروفیات کی جگہ اب موبائیل نے لے لی ہے۔ دنیا میں اس سے بہترین مصروفیت کوئی نہیں۔

ان تمام انتظار کرنے والوں میں بعض منچلے ایسے بھی ہوا کرتے ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ آیا وہ انتظارِ بس میں مبتلا ہیں یا انتظارِ یار کا شکار ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ انھیں کسی چیز کا انتظار نہیں ہوتا۔ ان کا شکار ان کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ شوقِ دیدار دیکھنا ہو تو انھیں دیکھئے اور شوقِ انتظار ملاحظہ فرمانا چاہیں تو اپنے آپ پر نظر ڈالئے۔

افق کے پار نگاہیں گڑی ہیں، کوئی سیاہ یا سرخ ہیولہ نظر آیا تو چہرہ پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر دھیرے دھیرے جو چیز نمودار ہوئی وہ یا تو ٹریکٹر تھا یا ایک عدد موٹی سی بھینس۔ پھر جو بسوں کا سلسلہ شروع ہوا تو درجن بھر بسیں چوکڑیاں بھرتی ہوئی سامنے سے گزر گئیں۔ آپ صرف یہ کہہ کر رہ گئے۔

انتظار تھا جس کا یہ وہ بس تو نہیں

تھک ہار کر پیدل چلنے کا فیصلہ کیا اور اپنے آپ کو سمجھایا کہ اک ذرا قدم اٹھنے کی دیر ہے

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

تیری منزل تو بس دو قدم ہی پر ہے، پھر جی کڑا کر کے دس قدم آگے نہ گئے ہوں گے کہ دیکھا آپ کی مطلوبہ بس خراماں خراماں چلی آرہی ہے۔اب راستے میں آپ نے اسے رکوانے کے لئے دونوں ہاتھ اٹھا کر روکنے کی امکان بھر کوشش کر ڈالی مگر وہ کہاں رکتی ہے عرش اور فرش کی آواز سے آپ پر گرد و غبار کا ایک بادل اچھال کر یہ جا وہ جا۔

اس وقت آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ انتظار جواب تک تلوار بن کر آپ کے سر پر سوار تھا دو دھاری تلوار بن گیا ہے۔آپ مارے طیش کے پیر پٹختے ہوئے چلنے لگتے ہیں۔اس اضطراری عمل کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ گھنٹہ بھر کا سفر پون گھنٹہ ہی میں طے ہو جاتا ہے۔گھر پہنچ کر پسینہ سکھاتے ہیں، آنسو تو خیر آپ راستے ہی میں خشک کر چکے ہوتے ہیں۔

ماہنامہ اوراق، لاہور

الپن

جانے کیوں محبت کے ذیل میں کیوپڈ کا تیر صدیوں سے تیر بہدف نسخہ کی طرح استعمال ہو رہا ہے۔اس سلسلہ میں کسی کو آج تک الپن سے استفادہ کی نہیں سوجھی۔الپن دو دلوں کی طرح دو کاغذات کو جوڑنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور کاغذوں کے سینے میں تیر نیم کش کی خلش بھی جگاتی ہے۔یوں تو کاغذ گوند سے بھی جوڑے جاسکتے ہیں۔مگر یہ کرسی اور لیڈر جیسا خالص سیاسی گٹھ بندھن ہے۔یہاں وہ خلش صفر ہوتی ہے جو محبت کیلئے ضروری ہے۔سچ تو یہ ہے کہ سیاست صفر سے ہندسہ برآمد کرنے اور پھر ہندسوں کے آگے صفر کی لمبی قطار لگانے کا ایک دلچسپ کھیل ہے۔یوں تو صفر کے معنی بھی خلش ہی ہیں اگر وہ جیب میں ہوں۔خلش دوستوں کے دل میں ہو تو باعثِ تشویش ہے اور دشمنوں کے دل میں اس کا پایا جانا موجبِ تفریح ہے۔

صفر ہی کی طرح الپن بھی حقیر اور پر تحقیر ہے۔کوڑے دان کی طرح صفر کے دن بھی بدلتے ہیں جب وہ کسی ہندسے سے شرفِ ملاقات حاصل کرے، اس تقریب خانہ آبادی میں صفر وقتی طور پر دولہے کی طرح اچانک غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔صفر کسی ہندسے سے منسلک ہو جائے تو اس کے بعد جس قدر صفر اس سے ملیں گے سب اس کے سر پر سرخاب کے پر لگاتے جائیں گے۔تنہا صفر اپنے گرد ہزار صفر بھی اکٹھا کر لے

تب بھی صفر کا صفر ہی رہتا ہے گویا صفر اور دیگر ہندسے دو مخالف اجناس ہیں۔اس سے صنفِ مخالف کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے بغیر آدمی کا وجود بھی ایک بہت بڑا صفر ہی ہے۔اول بھی صفر آخر بھی صفر۔

آدمی کی مشکل یہ ہے کہ وہ صفر سے برآمد ضرور ہوتا ہے(خواہ کیسا ہی کمترین کیوں نہ ہو) لیکن خود صفر نہیں ہوتا۔ماضی اور حال کے کاغذ کو جوڑتا ہے اور کسی دن ان اوراقِ پارینہ سے نکل کر راہیِ ملکِ عدم ہوجاتا ہے،تب وہ اپنے پیچھے ایک بہت بڑا صفر چھوڑ جاتا ہے۔آدمی کی زندگی بھر کی تگ ودو کا حاصل اور قابلِ دید چیز یہی ہے کہ وہ اپنے پیچھے کتنا بڑا صفر چھوڑ گیا،آدمی الپن ہی کی طرح زندگی گزارتا ہے،کبھی انگلیوں میں چبھ کر خلش جگاتا ہے اور کبھی محفل سے نکل کر۔

ہر شخص کے اندر پن ہی کی طرح ایک کٹیلی نوک ہوا کرتی ہے جو دشمنوں کی مزاج پرسی کے کام آتی ہے۔اسی قسم کی ایک نوک دوستوں کے پاس بھی ہوتی ہے جو کچھ زیادہ کٹیلی اور مستعد ہوتی ہے۔جن صاحبان کے پاس یہ شےِ لطیف نہ ہو،وہ الپن سے بھی زیادہ حقیر ہوتے ہیں۔ان کا بھرتا لذیز بنتا ہے اور جو ہمارے سماج کی مرغوب غذا ہے اسی لئے ایسے لوگوں کو سماج کا ہر فرد چاروں طرف سے کچل کر لذیذ بھرتا بناتا ہے اور چٹخارے لے لے کر کھاتا ہے۔

پن کا ننھا سا وجود عشق کی طرح امن کی بھی علامت ہے۔امن کا مطلب پن ڈراپ سائلنس ہے۔اسی کے حصول کے لئے جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ابتدائے آفرینش سے تا حال ہر زمانے میں امن کی شدید ضرورت رہی ہے۔جنگل اپنا قانون چلانے کے لئے امن کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پیاز کی طرح کبھی نایاب ہوجاتا ہے اور مہنگا بکنے لگتا ہے۔اسی طرح جنگوں کے زمانے میں مارکیٹ سے پیاز کا روپوشی اختیار کرنا اس بات کی طرف کی طرف اشارہ ہے کہ جنگیں امن اور پیاز کی باہمی سازش ہی کا نتیجہ ہیں۔امن کی فراہمی کے لئے ہی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔سچ ہے بغیر جنگ کے امن کیسے ہوسکتا

ہے۔لاشوں کے انبار پر وشوشانتی کے گیت گاتا ہوا پن ڈراپ سائلنس ہی امن کا مقصود ہے۔اس پر آشوب مشینی دور میں الپن کی فریادرسی کے لئے تیسری جنگِ عظیم کا سناٹا ضروری ہے لیکن پن سے اتنا انتظار نہ کھینچا گیا۔اس نے اپنے وجود کے ایک سرے پر نوک اگالی، بالکل اسی طرح جیسے بکری کے سینگ نکل آئے یا جس طرح میاں خوجی بار بار اپنی قرولی نکال لیا کرتے تھے۔پن کی ننھی سی نوک ہو یا میاں خوجی کی قرولی، جہادِ زندگی کا بڑا سہارا ہے۔ جیسے چیونٹی مرتے مرتے کاٹ لے۔ جیسے کسی بھیانک خواب سے گھبرا کر کوئی ایک خطرناک چیخ کے دامن میں پناہ گزیں ہو جائے۔اسی لئے جھریوں زدہ لرزتے ہاتھوں میں تھمی ہوئی چھڑیاں جسموں کے شکستہ مکان سے زیادہ گرتے ہوئے حوصلوں اور جذبوں کے ڈاک بنگلوں کو سنوارنے کا کام دیتی ہیں۔

الپن بھی ایک ایسے ہی حوصلہ کا سرچشمہ ہے۔خاص طور پر اس وقت جب خبروں میں بم اور میزائلوں کے دم بہ دم دھماکے سن کر کوئی خود کو خرگوش کے قالب میں محسوس کرتا ہو۔بار بار چونک پڑتا ہو۔اسی طرح دوسرے کمرے میں بیٹھا کوئی آسور راکشس جو سماج کے امن وسکون کی گائیں بھگا لے گیا ہے۔کاش ٹیبل پر بکھری ہوئی الپنوں کی سی بےفکری ہمارا بھی مقدر ہوتی کہ کسی نے زورزبردستی کی تو نوکِ مبارک سلامت ہے۔جسے فقط اپنی ہی خیریت نیک مطلوب ہے۔انگلی میں کچھ سے چبھ کر خوابِ غفلت سے نہ جگایا تو کچھ نہ کیا۔میرے خیال میں پھول کے محافظ کانٹے اور الپن کی نوک بیل کے سینگوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔میں جب کسی کا یہ بیان سنتا ہوں کہ ہمارے پاس اس قدر موثر ہتھیار موجود ہیں کہ پلک جھپکتے ہی ساری دنیا کو ختم کر دیں تب خیال آتا ہے کہ میاں خوجی اب بھی بقیدِ حیات ہیں۔خوجی کی قرولی سے الپن کی نوک تک ایک ہی سلسلہ ہے۔خوجی ہمارے اندر ہر دور میں زندہ رہے گا۔خوجی زندہ باد، الپن زندہ باد۔

ماہنامہ شاعر، ممبئی، انشائیہ نمبر جلد ۷۵، شمارہ ۷

ڈاڑھیاں

ٹھوڑیوں سے اگ کر مسلسل پھیلتی ہوی بالوں کی وہ آبادی جو کانوں کی لوءوں تک چلی جاتی ہے ڈاڑھی کہلاتی ہے۔ بعض ٹھوڑیوں پر بالوں کا ایک جزیرہ بھی پایا جاتا ہے جو فرنچ کٹ ڈاڑھی کہلاتا ہے۔ دنیا کی بڑھتی ہوی آبادی کو دیکھ کر لوگ اب نہ صرف بال بچّوں سے بلکہ چہرہ پر اگنے والے بالوں سے بھی ڈرنے لگے ہیں۔ اسی لئے یہ خطّہ کبھی سیفٹی ریزر کی زد میں رہتا ہے، کبھی سیدھے اور کبھی الٹے استرے سے مونڈھا جاتا ہے۔ اوزیادہ ترزبانوں کی چلتی ہوءی قینچیوں کے درمیان پھنسا رہتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں ڈاڑھی بزرگی کیی علامت ہے اور مونچھ مردانگی کی نشانی۔ گذشتہ دنوں چند عورتوں کے چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں دیکھ کر ہم قدرت کی منصف مزاجی کے قائل ہو گئے کہ اس نے مردانگی پر مردوں کی اجاہ داری نہ رکھی۔ بلکہ عورتوں کو بھی اس سے معقول حصّہ عطا کیا۔

مونچھوں کی عقلمندی دیکھئے کہ انھوں نے مردانگی کو اپنے ساتھ وابستہ کرلیا۔ اسی لے بن مونچھوں والے کبھی کبھار ہی مونچھ والوں کی شان میں کچھ کہنے کی جرأت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ڈاڑھیاں اپنی بزرگی میں گم رہیں، یہی وجہ ہے کہ سال بھر کا بچّہ بھی گود میں پہنچتے ہی سب سے پہلا حملہ ڈاڑھی پر کرتا ہے۔ بال ترشواتے وقت حجّام کی منہ زور قینچی

بھی بار بار ڈاڑھی کا رخ کرتی ہے۔ مائیں اپنے بچّوں کو یہ کہہ کر ڈراتی ہیں کہ سو جا نہیں تو ڈاڑھی والا بڈّھا آجاے گا۔

پہلے پہل ہم آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتے تو سبزہ دیکھ کر خیال آتا تھا کہ شاید ہماری ذات میں کوئی بزرگ چھپے بیٹھے ہیں اور باہر آنا چاہتے ہیں، ہم ہر بار استرا اٹھا کر ان کی راہ کھوٹی کر دیا کرتے تھے، مگر وہ تو جان کو ہو رہے تھے۔

دراصل آدمی اپنے اندر کے اس بزرگ اور ذمّہ دار آدمی کو اپنانے سے کتراتا ہے۔ لوگ اسی لے بلاناغہ شیو بنانے کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے ہیں۔

لوگوں کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ چہرے پر کھونٹیاں زیادہ بڑھ گیں تو کچھ خاص قسم کے یونی فارم لا کر ان پر ٹانگ دیں گے کہ لو انھیں پہنو۔ اس خام خیالی کے باوجود ڈاڑھیاں معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ بچّوں کو اور ڈاڑھیوں کو پیدا ہونے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔

ڈاڑھیوں کے پیدا ہونے کی کئی وجوہات ہیں کبھی مذہب بزرگانہ شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے، کبھی کوئی نیا فیشن ڈاڑھی کی صورت میں اپنی بہار دکھاتا ہے۔ کبھی خود نمائی کے ہاتھ ڈاڑھی بڑھاتے ہیں، البتہ ڈاڑھی کے ساتھ چند تصویریں کھنچوانے کے بعد پہلے جیسا نظر آنے کی خواہش ڈاڑھی پر استرا پھیر دیتی ہے۔ کبھی وہ ایام جو بال ترشوانے میں مانع ہوتے ہیں، ڈاڑھیوں کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں اور اس صبر آزما مدت کے ختم ہوتے ہی ڈاڑھی والا ڈاڑھی کے روپ میں فصلِ ثواب کاٹتا ہے۔ ظاہر ہے جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ بعض لوگ دنیا سے خفا ہو کر یہ کہہ کر ڈاڑھی بڑھا لیتے ہیں

دنیا سے خفا میں بھی ہوں ناراض ہے تو بھی
میں ڈاڑھی بڑھا لیتا ہوں تو بال بڑھا لے

لوگ اپنی ہونے والی بیوی کے حال پر ترس کھا کر بھی ڈاڑھی بڑھاتے ہیں کہ کسی طرح اس

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

غریب کے ہاتھ پیلے ہوسکیں۔نکاح کے بعد جب سہرا الٹا جاتا ہے تو دولہے میاں کا چہرہ بے داغ صبح کا منظر پیش کرتا ہے۔ڈاڑھیوں کے مقابلے میں مونچھوں کا چلن عام ہے اسی لئے لوگ سب کی مونچھیں چھین کر بڑا بن جانے کی کوشش میں سر گرداں نظر آتے ہیں۔

سیاہ کمبل برسوں دھوئے جانے کے بعد بھی اپنا رنگ نہیں چھوڑتا ۔مگر ڈاڑھیوں کا رنگ ایک مدت بعد ہی اپنے نکھار پر آتا ہے۔کمبل ہی کی طرح آدمی ڈاڑھی چھوڑ دیتا ہے مگر ڈاڑھی اسے نہیں چھوڑتی ۔ پکی ہوئی اجلی سفید ڈاڑھیوں پر دعاؤں کی فصلیں لگتی ہیں جنھیں آئندہ نسلیں کاٹتی ہیں۔گلشن کے کاروبار میں مست سدا بہار طبیعتیں گلوں میں رنگ بھرنے لگتی ہیں تو خضاب چہرہ پر اپنی بہار دکھاتا ہے ۔مناسب قد و قامت کی ڈاڑھیاں صاحبِ ڈاڑھی کی شخصیت کا اٹوٹ انگ بن جاتی ہیں ۔اس قسم کے لوگ مدتوں آنکھوں میں بسے رہیں اور پھر اچانک ان کی بنا ڈاڑھی والی تصویر سامنے آجائے یا وہ بنفسِ نفیس اسی روپ میں ہمارے سامنے حاضر ہوجائیں تو ہم بے اختیار اناللہ و انا الیہ راجعون پڑھ لیتے ہیں۔بعض چہروں کو ڈاڑھیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرتے زمانے گزر جاتے ہیں کہ یہ چہرے ان ڈاڑھیوں کے ساتھ اپنی انفرادی شناخت کا سودا کرنے پر کسی طور راضی نہیں ہوتے ۔بعض چہروں پر ڈاڑھیاں اپنا وجود اس طرح گنوا بیٹھتی ہیں جیسے ندی سمندر میں گم ہوجائے۔ان چہروں پر ڈاڑھی ڈھونڈنے کے بجائے چہرے میں ڈاڑھی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔

اچھی ڈاڑھیاں وہی ہوا کرتی ہیں جو آدمی کے چہرے کے علاوہ برگد کی جٹاؤں کی طرح اس کی ذات میں پھیل جائیں اور اس کے وجود کو ایک عدد گوتم بدھ فراہم کردے جو اپنی ہستی کے برگد تلے نروان کا متلاشی ہو۔

سہ ماہی کاروانِ ادب، ناگپور

فیل گڈ

الکشن کا ہنگام ہے اور سیاسی گلیاروں میں ایک نعرہ اچھالا گیا جو خاصی دھوم مچا چکا ہے ۔ یہ ہے فیل گڈ، مشکل یہ آپڑی تھی کہ اسے مشورہ خیال کیا جائے یا تنبیہ الغافلین کے خانے رکھ دیا جائے ۔ چونکہ یہ نعرہ سیاسی میدان سے آیا ہے تو یوں ہی سا تو ہو نہیں سکتا کوئی سیاسی جماعت اگر چھینک دے تو اس میں بھی نعرہ جیسی برجستگی ہوتی ہے اس میں مکر و فریب اور مصلحت کے جراثیم بھی ضرور موجود ہوتے ہیں ۔ فیل گڈ کا انداز بھی کچھ ایسا ہی ہے ، اس میں sorry جیسی معذرت تو ہر گز نہیں thank you کی سی شکر گزاری کا تاثر بھی عنقا ہے ۔ اسے سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ہمیں مخلصانہ مشورہ دے رہا ہے کہ اپنا خیال رکھیے گا ۔ تاہم یہ ایک سیاسی نعرہ ہے اس لئے اس میں یہ پیغام بھی پوشیدہ ہے ۔ ؛ ہمارا یعنی ہماری پارٹی کا خیال رکھئے گا ۔

ادھر الکشن سر پر کھڑا ہے اور یہ نعرہ منظر عام پر آیا تو سبھی کے کان کھڑے ہو گئے ، کہ یہ اچانک فیل گڈ کہنے کی کیا تک ہے ۔ یقیناً دال میں کچھ کالا ہے ۔ جواب میں کوئی یہ بھی کہہ چکا ہے حضور ، یہاں تو ساری دال ہی کالی ہے ۔

چونکہ اب لوگوں کو لبھانے کے زمانے نہیں رہے ، اب تو ہر عزت مآب کے

دامن پر داغوں کا چمن کھلا ہوا ہے۔اسی لئے عوام سے کہنے کو اب یہی باقی بچا ہے؛ کہ خوش گمانی سے کام لیتے ہوئے فیل گڈ کریں۔سب کچھ تو آپ کی محسوسات پر منحصر ہے،آپ گلاس کو آدھا بھرا ہوا دیکھتے ہیں یا آدھا خالی۔خواہ آپ اسے ہپناٹائز کرنے کی کوشش ہی کیوں نہ قرار دیں ،ووٹ بنک سے عوام کی وابستگی اکثر ایسے کرشمے دکھاتی ہے جہاں خرد کا نام جنوں پڑ جاتا ہے اور جنوں کا خرد۔تب سارے عیب ہنر نظر آنے لگتے ہیں۔بس ووٹ بینک کو ذرا trance میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ مسئلہ بھی مسائل اور معاملات کے سہارے بہ آسانی حل ہو جاتا ہے۔ہمارے ملک میں مسائل اور معاملات حل کرنے کے لئے نہیں الکشن لڑنے کے لئے اور لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لئے ہوا کرتے ہیں۔کوئی مدّا یا معاملہ کھڑا کر کے سیاسی پارٹی عوام کے ہاتھوں میں جھنجھنا تھما دیتی ہے۔عوام کو جب یہ مشغولیت ہاتھ آجاتی ہے تو اسے یہ پوچھنے کی فرصت کہاں کہ مدعا کیا ہے۔ہمارے یہاں سیاسی رہنما عوام کو اب بھی بچہ ہی سمجھتے ہیں۔آدھی صدی گزر چکی ہے۔آئندہ چند برسوں میں یہ آزاد ملک سینیر سٹیزن بن جائے گا،تاہم عوام مسائل کے کھلونوں سے لطف اندوز ہونے میں بچوں کی طرح مصروف ہے۔

بلا شبہ فیل گڈ کے نعرہ کو خاصی مقبولیت حاصل ہو گئی ہے۔ممکن ہے کسی دن کوئی آپ کی آنکھوں میں مرچ پاؤڈر چھڑک کر کہے؛ فیل گڈ۔لٹیرے گھر کا سارا سامان لوٹ کر لے جائیں اور اپنے پیچھے ایک چٹ چھوڑ جائیں؛ فیل گڈ۔کوئی کسی راہگیر کو ایک چپت رسید کرے اور کہے؛ فیل گڈ۔

انسانی جذبات اور احساسات کمپیوٹر کی طرح تو نہیں ہیں کہ کسی بڑے شہر میں بیٹھا ایک شخص فیل گڈ کا بٹن دبائے اور آپ کے دل و دماغ کے سکرین پر مطلوبہ جذبات و احساسات ابھرنے شروع ہو جائیں۔احساس تو محبت کی طرح اختیاری چیز ہے،جسے غالب نے آتش قرار دیا ہے،جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

سوال یہ ہے کہ جسے فیل گڈ کرنا ہوگا وہ خود ہی کر لے گا۔ کسی کے مشورہ کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ موسم بدلتے ہی ہر طرف خوشگوار فضا قائم ہوگئی ہو اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تو ریڈیو، ٹی وی اور اخباروں کے ذریعے یہ اعلان کروایا گیا کہ اہل وطن سے گذارش ہے کہ وہ فیل گڈ کریں۔ یا انڈیا کی کرکٹ ٹیم کی شاندار کامیابی پر یہ اعلان کیا جارہا ہو کہ اب آپ پٹاخے داغ سکتے ہیں اور فیل گڈ کر سکتے ہیں۔ یا چھٹے پے کمیشن کی جانفزا سفارشات پر سرکاری سہولتوں کے ساتھ یہ اطلاع بھی نتھی ہو کہ اب ملازمین گڈ فیل کریں۔

فیل گڈ تلقینِ صبر کا انگریزی ترجمہ یا حرفِ تسلی تو ہوسکتا ہے سرکاری حکم نامہ نہیں ہوسکتا۔ زندگی کے سفر میں فیل گڈ ایک پڑاؤ ہے۔ یہ راستہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ہاں منزل بننے کی صلاحیت اس میں موجود ہے۔ ہر شخص ہمیشہ خوش نہیں رہ سکتا۔ اگر اسے مستقل طور پر اسی Mode میں ڈال دیا جائے تو وہ جمادات بن جائے گا۔ فیل گڈ سے انحراف کرنے والی طاقت اضطراب اور بے چینی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو انسان کو آمادہ سفر کرتی ہے، اپنی محدود دنیا سے باہر نکل کر نئے جہانوں کی دریافت کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ زندگی کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم اپنے خول سے باہر نکل کر کچھ حاصل کریں تاکہ ہمیں فیل گڈ کا لمحہ انعام کے طور پر حاصل ہو سکے اور ہم اس پر بجا طور پر فخر کرسکیں کہ یہ ہمارے دست و بازو کی کمائی ہے۔ پر مسرت لمحات ہماری زندگی سے بار بار غائب ہوجاتے ہیں ہم ان کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں، زندگی اسی آنکھ مچولی کا نام ہے۔

ہمارے پڑوسی مولوی عنایت صاحب تو فیل گڈ کا نعرہ دینے والی سیاسی پارٹی کو اصحاب الفیل کے لقب سے نواز چکے ہیں۔ ہم باوجود لاکھ کوشش کے انھیں سمجھا نہیں پائے کہ یہ فیل گڈ ہے کیا بلا؟ ہماری تمام دلیلوں کو نہ سمجھنے کے بعد وہ بولے، جناب ہم آپ سے ایک سوال پوچھیں؟

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

ہم نے کہا، ضرور۔ کہنے لگے۔۔ایک بیماری ہوتی ہے فیل پا جس میں مریض کے پاؤں پھول کر ہاتھی جیسے ہو جاتے ہیں اسی مناسبت سے اسے فیل پا کہتے ہیں فیل یعنی ہاتھی اور پا یعنی پاؤں۔آج کل حکومت اپنے کارناموں کو جو بڑھا چڑھا کر ہاتھی کے پاؤں اتنا موٹا کرر کے دکھا رہی ہے کہیں یہ حکومت بھی تو فیل پا کے مرض میں مبتلا نہیں؟ پاؤں کتنا ہی موٹا کیوں نہ نظر آئے بہر حال ہوتا مرض ہی کا نتیجہ ہے۔

ماہنامہ پارسا، بوریوالا (پاکستان)

بلیک بورڈ

اپنی تعلیم گاہ کو الوداع کہتے ہوئے فطری طور پر جس دکھ اور محرومی کا احساس ہوا کرتا ہے، اس میں آزاد ہو جانے کی خوشی بھی دل کے کسی گوشے میں ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ میرے لئے تو اس قسم کا ہر موقع یوں بھی مسرت بخش رہا ہے کہ مجھے ایک سخت ناپسندیدہ شے سے چھٹکارہ ملا۔ وہ ہستی جسے ہم رقیبِ روسیاہ کہہ کر پکارا کرتے تھے، عرفِ عام میں اسے بلیک بورڈ کہا جاتا ہے۔ میں نے اسے ہستی اس لئے کہا کہ ایذا رسانی کے معاملہ میں جاندار جس قدر فعال اور سرگرم ہوا کرتے ہیں، بے جانوں میں وہ بات کہاں! بلیک بورڈ مجھے ہمیشہ ہی کوئی جیتی جاگتی چیز محسوس ہوا ہے، اس وقت بھی جب استادِ محترم بورڈ پر کوئی اقتباس لکھ کر، بچوں کو اسے نقل کرنے کا حکم صادر فرما کر دیوار سے ٹکی کرسی پر براجمان ہوتے ہی نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں، بلیک بورڈ جاگتا رہتا ہے اور اس پر بکھری سفید لکیریں سورج کی شعاؤں کی طرح ہماری بیاضِ زندگی کو روشن کر رہی ہوتی ہیں۔

ہماری تعلیمی زندگی میں ہم پر نازل ہونے والی ہر نئی آزمائش سب سے پہلے اسی بورڈ پر نازل ہوتی، اور جب ہم اس پر پورے نہ اتر پاتے تو اساتذہ اپنا سارا غصہ ہم پر اتارتے۔ اس زمانے میں ہماری چند مجبوریوں میں تختہ سیاہ کی (ناقابلِ قبول) صورت

کو دیکھنا بھی شامل تھا۔ ٹیچرس آتے اور اپنا علمی سرمایہ طلبا کے سروں پر انڈیل کر چلے جاتے۔ میں سوچتا رہتا کہ یہ بلیک بورڈ نہ جانے کب اپنی صورت کالی کرے گا مگر وہ تو تھا ہی ازلی صورتِ سیاہ۔ کہاں جاتا؟ مجھے ہمیشہ اس کی صورت سے خدا واسطے کا بیر رہا۔ ایک تو اس کے ظاہری سراپے کو دیکھ کر کوئی خوشی نہ ہوتی اور جن مشقتوں میں ہمیں مبتلا کیا جاتا تھا، اکثر اسی کے توسط سے ہم تک پہنچا کرتی تھیں اسی لئے لاشعوری طور پر وہ ہمارا دشمن بن گیا۔

ہر استاد اجلے اجلے چاک کی مدد سے اسے روشن کرنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالتا اور علم کی روشنی پھیلا کر تھک ہار کر چلا جاتا، سنا ہے کوئلے کی دلالی میں صرف ہاتھ کالے ہوتے ہیں، اس بارِ علم کی بار برداری میں اساتذہ کی انگلیاں روشن ہو جاتیں، جاتے جاتے وہ اس روشنی کو وہیں جھٹک کر چلے جاتے اور کسی کند ذہن طالبعلم کی طرح جو ہر جماعت میں پایا جاتا ہے، بلیک بورڈ بھی، جوں کا توں اسی کلاس میں بنا رہتا اور برسوں وہیں ٹکا رہتا۔

پرائمری اسکول میں اپنی کلاس میں بیٹھے بیٹھے میں اکثر یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ گھنٹی بجی، ٹیچر نے اپنا سبق جیسے تیسے ختم کیا اور کلاس سے رخصت ہونے لگے تو بلیک بورڈ بھی چپکے سے دیوار سے اترا اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور کسی دوسری کلاس میں جا کر اپنے اوپر لکھے ہوئے نکات طلبا کو لکھانے لگا۔ جاگتی آنکھوں کے اس خواب کو میں نے کبھی سچ ثابت ہوتے نہیں دیکھا۔

اکثر یہ خیال آیا کہ کالے کلوٹے چوکور بورڈ کے بجائے اجلا اجلا سا کوئی خوبصورت سا بورڈ بھی تو ہو سکتا تھا۔ (یہ خواب پورا ہوا بھی تو اس وقت جب ہم اس بورڈ کی غلامی کے اندھیرے سے آزاد ہو چکے تھے۔ اب اکثر اسکولوں اور کالجوں میں سبز رنگ کے بورڈ استعمال ہوتے ہیں جو ان کی خوشحالی کی علامت ہیں) مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو حافظے کے بورڈ پر اب بھی لکھا ہوا ہے، وقت کا ڈسٹر بھی مٹا نہیں پایا۔ ہوا یہ کہ

امی نے دیوار پر سفیدی کروا رکھی تھی۔ میری طبیعت جو گد گدائی تو کوئلہ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس پر مصوری کا جادو جگانا شروع کر دیا۔ والد صاحب کی نظر پڑی تو وہ پٹائی ہوئی کہ پیٹھ پر ہرے نیلے نشانات ابھر آئے۔ اس دن میری پیٹھ بھی ایک تختہ سیاہ بن گئی۔ جس زلزلہ اور طوفان کا مجھے سامنا کرنا پڑا اور آنسوؤں کی جس باڑھ سے گزرنا پڑا اس کے ذریعہ پہلا سبق یہ سمجھایا گیا کہ اچھی بھلی صاف ستھری چیزوں کو خراب کرنا ادب اور شائستگی کے خلاف ہے۔

نہ جانے کیوں آج بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں جتنے زلزلے، طوفان اور سیلاب آتے ہیں کہیں نہ کہیں اسی سبق کو دہراتے ہیں، مگر دنیا کے غبی طلبا اسے سمجھ ہی نہیں پاتے اور دنیا کے ہر کونے میں اجلی اجلی دیواروں پر اپنے کرتوت کے کوئلے سے گناہوں کی تصویریں بناتے جا رہے ہیں۔

تختہ سیاہ پر چاک سے ابھرنیوالی لکیریں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ دنیا میں برائی کا اندھیرا ہر طرف پھیل چکا ہے۔ اس کالی تختی پر اساتذہ کے ہاتھوں سے ابھرنے والے نقوش ستاروں کی طرح خواہ کتنے ہی ننھے کیوں نہ نظر آئیں واقعتاً ہیں وہ عظیم کہ برائیوں کے اس اندھیرے میں ان سے روشنی ہو نہ ہو منزلوں کا پتہ تو ملتا ہے۔ ان ستاروں کا حسن بھی اسی اندھیرے کا مرہونِ منت ہے۔ اندھیرا نہ ہو تو وہ اپنی چمک دکھائیں کہاں؟

دراصل دنیا میں چھایا ہوا باطل ایک عظیم بلیک بورڈ ہی ہے جس پر حق ایک تحریر کی شکل میں موجود ہے اس کی حقانیت کو اور زیادہ واضح کر کے پیش کر رہا ہے مگر اکثر طلبا بڑے کند ذہن ہیں البتہ عقلمندوں کو یہ اشارے کافی ہیں۔

ایک مدت بعد جب میں نے بی ایڈ کے لئے تربیتی کالج میں داخلہ لیا اور کلاس روم میں پہنچا تو میری بے بسی کو منہ چڑاتا ہوا وہی بلیک بورڈ میرے رو برو تھا۔ ذرا دیر بعد جو ٹیچر کلاس میں داخل ہوا اس کا رنگ بھی تختہ سیاہ سے میل کھاتا ہوا تھا۔ میں نے ان دونوں کو حقارت سے دیکھا کہ ان دو بدصورتوں سے کسی حسین چیز کی توقع فضول ہے

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

۔جب ٹیچر نے اپنا لکچر شروع کیا اور زبان کھولی تو گویا علم کا خزانہ کھل گیا۔ مجھے محسوس ہوا میرے رو برو بلیک بورڈ نہیں ایک قد آدم آئینہ سجا ہوا ہے جس میں میری جہالت اور کم ظرفی کا اندھیرا عکس بن کر براجمان ہے۔ پھر استادِ محترم نے سفید چاک کی پے بہ پے ضربوں سے اس جہالت کے اندھیرے کو بھگانا شروع کیا تو میرے اندر چھپے بیٹھے نخوت، حقارت اور نفرت کے بھوت بھی نکل بھاگے۔

مجھے یقین ہے دیوار میں چنا ہوا وہ بلیک بورڈ آج بھی اسی طرح سیاہ ہوگا لیکن ہمارے اندر چھپا بیٹھا جہل کا اندھیرا ایک روشن صبح میں تبدیل ہو چکا ہے۔

جوانوں کو پیروں کا استاد کر

برسوں پہلے اقبال کی کسی نظم میں یہ مصرع پڑھ کر ہم سوچ میں پڑ گئے تھے کہ علامہ کو آخر ہوا کیا ہے جو ایسی عجیب وغریب دعا مانگ رہے ہیں۔ چند لمحوں کے لئے اس انوکھی کلاس کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ایک بچہ ماسٹر کسی بزرگ کو اس خطا پر مرغا بنائے ہوئے ہے کہ آں جناب اپنی عادت سے مجبور صحیح وقت پر اسکول کیوں آ گئے؟ دوسرا نوجوان ایک بزرگِ ہشتاد سالہ پر برس رہا ہے کہ کلاس میں بیٹھے کھانس کھانس کر ہماری نیند خراب کرتے ہو اور کوئی بڑے میاں اس لئے عتاب کا شکار ہیں کہ ہوم ورک مکمل کرنے کی اتنی جلدی کیوں پڑی تھی، کیا وقت بھاگا جا رہا تھا؟ ادھر ایک بچہ پیر لب گور کو اٹھارہ کا پہاڑہ پڑھا رہا ہے اور پلے گراؤنڈ میں ایک بچہ پی ٹی ماسٹر ایک حضرت کو لگاتار دوڑا رہا ہے موصوف دوڑتے کم ہیں، ہانپتے اور کانپتے زیادہ ہیں اور اس سے بھی زیادہ کھانستے جاتے ہیں۔ فلم کی طرح چلنے والا یہ منظر جلد ہی آنکھوں کے آگے سے اس طرح ہٹ گیا جیسے کوئی آرٹ فلم باکس آفس پر پٹ جاتی ہے۔

کل ہی کا واقعہ ہے ایک بچہ کو دیکھا وہ اپنے دادا جان کو ایک موبائیل ہاتھ میں لئے یہ سمجھا رہا تھا کہ کسی کا نام اس میں کس طرح Save کیا جاتا ہے اور فون Silent

Mode میں چلا جائے تو اسے گویائی کس طرح عطا کی جاتی ہے۔سچ تو یہ ہے ہمیں بچے کی تدریسی لیاقت سے زیادہ بڑے میاں کے علمی شوق اور تکنیکی ذوق پر رشک آیا۔ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ جلد یا بدیر ہی سہی اقبال کی مذکورہ دعا شرف سے قبولیت سے بہرہ ور تو ہوئی۔

جس زمانہ میں ہم نے یہ مصرع سنا تھا ہم اقبال کے اس قدر مداح تھے کہ ان کے کسی خیال سے اختلاف کا تصور بھی محال تھا۔وقت کے پل تلے سے بہت سا پانی اور بہت کچھ بہہ گیااور اب جب کہ ہم بھی بزرگی کے علاقہ سے قریب تر ہو گئے ہیں،اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی کلیم الدین احمد اور یاس یگانہ کے Mode میں آ گئے ہیں ۔اب اقبال ہماری نظر میں اس قدر بلند نہ رہے۔رہ رہ کر خیال آنے لگا کہ کیا ضرورت تھی ایسی نامعقول دعا مانگنے گی۔مانا کہ بزرگوں نے عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ گنوا دیا،تنخواہ سے پنشن پر آ گئے،دانت بینائی،بال،سوجھ بوجھ کھو بیٹھے،قویٰ مضمحل ہو گئے،تاہم کیا ان کے پاس جوانوں کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں رہا؟ جو بچوں کو آگے بڑھ کر انھیں درس دینے کی نوبت آ گئی۔

اس نکتہ پر بھی غور کر لیجئے ،آج کے بزرگوں کے پاس نوجوانوں کے لئے کیا ہے؟ دودھ سے جلے تجربات سے برآمد شدہ چھانچھ کو پھونک پھونک کر پیتی ہوئی بصیرت،وقت کے غاروں سے برسوں بعد باہر نکلے ہوئے ان اصحابِ کہف کے پاس اخلاقی قدروں کے وہ پرانے سکے ہیں جو رائج الوقت نہیں رہے۔کسی دانا کا قول ہے کہ ہر تیسری نسل اپنے اسلاف سے منحرف ہو جاتی ہے۔اس ریت گھڑی کو الٹ کر دیکھئے۔ کیا نوجوانوں کی عادات،مرغوبات اور معتقدات بزرگوں کو قبول ہیں؟اور یہ کوئی نئی بات نہیں،یہ کہانی ہر دور میں دہرائی جاتی رہی ہے۔

اقبال کیا کہنا چاہتے ہیں ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں، اقبال جو نصاب بزرگوں کو پڑھوانا چاہتے ہیں، ہمارے نوجوان عام طور پر اس سے دور بھاگتے ہیں ۔مگر عام معنوں میں نئی تکنک اور ضروریاتِ زندگی نے نوجوانوں کو استادی کے منصب پر فائز ضرور کر دیا ہے ۔ کسی بھی صورت میں سہی اقبال کی دعا قبول تو ہوئی ۔ پتہ نہیں کیوں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انسانی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بوڑھوں نے اپنی رستمی کے زعم میں نوخیز سہرابوں سے ہار مانی ہو مگر موبائیل، کمپیوٹر، سائنسی انکشافات اور زمانے کے نرالے انداز نے شاہ نامہ ایران کے اس مشہور قصہ کا آخری حصہ بدل کر رکھ دیا ہے ۔

دراصل یہاں آنے والا ہر انسان اس دنیا کو پکنک اسپاٹ سمجھتا ہے، وہ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ حقیقتاً اسے یہاں سبق سکھانے کے لئے بھیجا گیا ہے ۔اسکول یا کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی اسی قسم کی غلط فہمی ہوتی ہے کہ اب سیکھنے کا سلسلہ بند ہو چکا ،جو لوگ تدریس کے پیشے میں جاتے ہیں اپنے اوپر لادی جانے والی ہر محکمہ جاتی ٹریننگ کے دوران اس اذیت سے گزرتے ہیں جو انھیں رہ رہ کر احساس دلاتی ہے کہ ہم تو ساری دنیا کو سکھاتے ہیں، یہاں ہمیں کیوں پڑھایا جا رہا ہے؟ آدمی نہ سیکھنا چاہے تب بھی زندگی رنگ بدل بدل کر ہمیں نئے نئے سبق سکھاتی ہے ۔

ہر دن کتابِ زندگی کے ایک بالکل نئے صفحہ کی طرح کھلتا ہے، ہر رات صفحہ ہستی کے بلیک بورڈ پر ستارے سجا کر نئی سمتوں کا پتہ دیتی ہے ۔ ہر صبح نئی منزلوں کی بشارت بن کر طلوع ہوتی ہے ۔کالج سے لیا گیا آخری لیونگ سرٹیفکٹ تو دنیا کی طرح دھوکہ ثابت ہوتا ہے ۔کھیل کھیل میں سکھانے کا کام زندگی چپکے چپکے جاری رکھتی ہے اور انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کا ڈیتھ سرٹیفکٹ ہی دراصل اس کا لیونگ سرٹیفکٹ ہے ۔

گنگنانا

گنگنانا اور نہانا دونوں کا پیدائشی وطن ایک ہی ہے، حمام خانہ۔ میں ان دونوں اعمال کو جڑواں بھائی تصور کرتا ہوں۔ نہانے کی طرح گنگنانا بھی ایک فرحت بخش عمل جو ٹھہرا۔ ممکن ہے کوئی صاحب اقبال کے مشہور مصرعے:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

سے مرعوب ہو کر گنگنانے کو بے عملی قرار دیں لیکن حقیقتاً یہ ایک ایسا معصوم اور بے ضرر سا عمل ہے جسے کسی کی زندگی بنانے یا بگاڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ گانے کی بات علیحدہ ہے۔۔۔ کسی گویے کا پڑوس بھری پری زندگی کو جہنم میں بدل دینے کے لیے کافی ہے۔

گانا ایک سماجی عمل ہے، گنگنانا انفرادی فعل۔ سبکسار گنگناہٹ کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ موسیقی کے آلات جمع کرتی پھرے اور راگ رنگ کی محفلوں کا اہتمام کرے۔ گانے کا عمل یہ سارے حربے اپناتا ہے۔ وہ سامعین سے مختلف سطحوں پر رابطہ قائم کرتا ہے۔ کبھی وہ آپ کو موضوع بنائے گا اور کبھی مخاطب۔ کبھی اپنے من کی بات آپ سے کہے گا اور کسی دن آپ کی پیپتا ایک ماہر نفسیات کی طرح آپ پر منکشف کردے گا۔ اس کے برعکس گنگناہٹ صوفی منش، اپنے آپ میں مست من موجی کی ترنگ ہے۔ جو کبھی

Volume بڑھا کر اس سرور و نشاط کا فوارہ آپ پر بھی اچھال دیتا ہے۔ اسے نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے پروا۔ نغمہ سرائی پبلک اسپیچ سے مشابہ ہے جس پر عوام کو بغلیں بجانے اور رائے زنی کے جملہ حقوق حاصل ہیں۔ گنگنانا تو اپنے آنگن میں چارپائی پر بیٹھ کر اہل و عیال کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے کی طرح ہے جس پر نہ کوئی داد دیتا ہے نہ آ کر تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔

گنگنانے کا شغل تنہائی اور یکسوئی کے علاوہ کسی چیز کا طلب گار نہیں۔ مانا کہ لوگ باگ بھیڑ بھاڑ میں گنگناہٹ کے جادوئی تسلسل میں اسیر دکھائی دیتے ہیں۔ تنہائی وہاں بھی موجود ہوتی ہے خالص قسم کی تنہائی جیسے کوئی سمندر میں رہ کر بھی پیاسا ہو بھیڑ کے پر شور سمندر کو بلو کر ہی تنہائی کا امرت منتھن کیا جاتا ہے۔ جسے پی کر انسانی شخصیت زندہ رہتی ہے۔ تنہائی کا یہ امرت نہ ہو تو ہر طرف روبوٹ نظر آئیں۔ یہ تنہائی بھیڑ کے ردعمل کے طور پر انسانوں کے یہاں وجود میں آتی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کسی بیل کو تنہائی سے اکتا کر دوسرے بیل کی خیریت دریافت کرتے اور پھر گھنٹوں حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے دیکھا ہے؟

ہم جب تک بھیڑ کے احساس اور جبر سے دامن کش ہو کر اپنے من کی انجمن میں داخل نہ ہو جائیں گنگنانے کے قابل نہیں ہو پاتے۔ ایسے ہی کسی خوشگوار لمحے کے اڑن کھٹولے میں ہم پر گنگنانے کا موڈ طاری ہو جاتا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ نشاط و سرور کا کوئی سوتا اچانک ہمارے سینے میں پھوٹ پڑتا ہے جس کی بکھرتی لہریں ہمارے وجود میں پھیلتے پھیلتے ہونٹوں کی منڈیروں پر آ کر از خود گنگناہٹ میں ڈھل جاتی ہے۔

گنگناہٹ اکثر حمام میں جنم لیتی ہے کہ یہاں آدمی کا اپنے اندرون سے براہ راست رشتہ جڑ جاتا ہے گویا وہ حمام میں نہیں مراقبے میں چلا گیا ہو اور بدن کی صفائی کے مرحلے راہ سلوک کے مقامات بن گئے ہوں۔

میں جب غسل خانے سے نہا دھو کر نکلتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں

پورا صوفی بن چکا ہوں۔ پاک وصاف، بے ریا بے لوث جیسے بدن کے میل کے ساتھ روح کی آلائش بھی پانی میں بہہ گئی۔ اسی تزکیہ کے دوران ہم ہلکے پھلکے ہو کر گنگنانے لگتے ہیں۔ شاید اسی لیے محفلِ سماع میں گنگنانے کو خاص دخل ہے۔ اشلوک، آیتیں اور Hymn کی محبوب سواری یہی گنگناہٹ ہے۔ نظمیں اور اشعار جو دراصل آدمی کے اندر کے خبرنامے ہیں گنگناہٹ ہی کے کاندھے پر سوار فضا میں تتلیوں کی طرح بھٹکتے پھرتے ہیں۔

آدمی کا رشتہ اپنے اندرون سے جڑ جانے کی بات پر مجھے اپنے دوست مسٹر 'م' کی جیب کا خیال آ رہا ہے۔ مسٹر 'م' کی جیب میں ان کے اندرون سے تعبیر کرتا ہوں جس سے ان کا تعلق ہر وقت جڑا رہتا ہے۔ ان کی جیب دلی کی طرح بار بار اجڑتی اور بستی ہے۔ جب وہاں ویرانی سی ویرانی ہو تو مسٹر 'م' میر کی غزلیں گنگناتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ اونچی تان اڑائیں تو پڑوسی نہ صرف ان کے گیت کے بول سمجھ لیتے ہیں بلکہ اس خیال سے مسکراتے بھی ہیں کہ مسٹر 'م' کی جیب میں ریزگاری کا اژدحام ہے اور نوٹوں کا کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔

گنگناہٹ کی زندگی بہت مختصر ہوا کرتی ہے گویا ایک شبنم کا قطرہ برگِ گل پر نازل ہوا۔ اپنی نمی، شادابی اور اپنے وجود کے آئینے میں منعکس ہوتا ہوا نیلے آسمان کا دلربا منظر اور ایک روح پرور پاکیزگی کا آفاقی تصور پھیلا ہی رہا تھا کہ آسمان سے اک کرن اتری اور اس ننھے سے وجود کو اٹھا کر لے گئی۔ زندگی کی بھیڑ بھاڑ میں گنگناہٹ یکایک مل جاتی ہے اور پارس پتھر کی طرح ہمارے آہن صفت مزاج کو مسرت کے سونے میں بدل دیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گم ہو جاتی ہے۔ اس کی لائی ہوئی دولت بھی اسی کے ساتھ ہو لیتی ہے۔ تعجب ہے کہ ہمیں گنگناہٹ کی آمد پر کسی قسم کی خوشی اور رخصت پر غم و افسوس نہیں ہوتا۔ ہم اس کے عطا کردہ سرور سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ گنگناہٹ کی پری کب آئی اور کب چلی گئی۔

گنگناہٹ کی دھیمی دھیمی لے میں اک سکون وسرشاری کا دریا بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا منبع یقینا گنگنانے والے کا دل ودماغ ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے گنگناہٹ میں اک عالمگیر امن کا پیغام چھپا ہوا ہے۔ گنگنانے والے کی ذہنی راہ بھٹک جائے تو یہ موہوم سا صوتی ارتعاش آسمان میں بگولے کی چھوڑی ہوئی خزاں رسیدہ پتیوں کی طرح دھیرے دھیرے ہلکورے لیتا ہوا معمولات زندگی کی استوار کی ہوئی سخت زمین پر آکر تھم جاتا ہے۔

دل ودماغ میں موجود جس امن وشانتی کی فضا میں گنگناہٹ جنم لیتی ہے، وہ دھیرے دھیرے ہماری زندگی سے رخصت ہونے لگی ہے۔ ان پرندوں کی طرح جن کے چہچہوں سے پہلے شہر اور بن گونجا کرتے تھے۔ یہی حال دلکش نغموں کا ہے بعض اوقات جب ریڈیو کی تیز آواز فضا میں کسی نغمے کا بدن تراش رہی ہو۔ ہوائیں بھی اس منظر پر چپ سادھے کھڑی ہوں اور سارا ماحول ایک متجسس سماعت میں ڈھلنے لگا ہو تب اچانک کوئی آواز کا دشمن اپنی جگہ سے اٹھ کر ریڈیو کا گلا داب دیتا ہے، تب میں محسوس کرتا ہوں کہ جس طرح دنیا میں اچھے لوگوں کو چین سے جینے نہیں دیا جاتا اسی طرح اچھے نغموں پر بھی عافیت کی زمین تنگ ہے۔

گانے کی ابتدائی شکل یقینا گنگناہٹ ہے۔ ان دونوں میں رفتار کا ایک واضح فرق بھی موجود ہے۔ گنگناہٹ کا سفر چہل قدمی کی سی آہستہ روی سے جاری رہتا ہے۔ لوری کا بھی یہی انداز ہے۔ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ بھی شاید اسی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں فطرت کی سرکاری زبان یہی ہے۔ فطرت کے بیشتر مظاہر میں آوارہ خرامی کا یہی ایک مخصوص انداز نمایاں ہے۔ کیا ندیوں کی روانی اور کیا چاند تاروں کی گردشیں سب کا ایک ہی اسلوب ہے۔ سبزہ زار میں رینگتی ہوئی بھیڑوں کے ہمراہ کسی درخت سے ٹیک لگائے دھیمی لے میں بانسری بجاتا ہوا مست چرواہا بھی اسی سلسلہ کی

کڑی ہے اور فطرت سے ہم آہنگ بھی۔ اس کے برعکس شہروں میں سرپٹ دوڑتی موٹریں، دندناتی ریلیں اور مشینی عہد کی تیز رفتار کلیں، تمام فطرت کے خلاف ایک منظم جنگ میں شریک نظر آتی ہیں۔ اسی طرح جب ہوائیں آندھیوں کا چولا بدل کر دھرتی پر فطرت کی نشانیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑتی ہوئی سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں تو ان کا یہ عمل بھی خلاف فطرت معلوم ہوتا ہے۔

آندھی تھمنے کے بعد ہر طرف بکھری ہوئی خوشگوار فضا زبان حال سے یہ کہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کہ ایک لمبے سفر کی تھکن کے نتیجے میں ہوا نے راستے میں پڑاؤ ڈالا اور اس پر گنگنانے کا موڈ طاری ہوا تو مجبوراً آندھی کو اپنا سفر ملتوی کر دینا پڑا کیونکہ گنگناتا ہوا آدمی خواہ تھوڑے وقت ہی کے لیے کیوں نہ ہو محبت، نرمی، رحم، ہمدردی اور شفقت کے دائروں میں اسیر ہو جاتا ہے۔ چھتے سے ٹپکتے ہوئے شہد کی طرح محبت اس کے سینے میں بوند بوند نتھرتی ہے۔

شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے لے کر ندیوں، ہواؤں اور چاند تاروں کی گردشوں تک پوری کائنات میں گنگناہٹ کی ایک دھیمی دھیمی سی لے جاری وساری ہے۔ جیسے کوئی کائنات کے پنگوڑے میں لپٹی ہوئی زندگی کو دھیرے دھیرے لوری سنا رہا ہو۔

غنودگی بڑھ رہی ہے اور وہ لمحہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے جب فنا کی ایک طویل نیند ہر ذی روح پر اپنا تاریک سایہ پھیلا دے گی۔

ماہ نامہ آج کل، نئی دہلی نومبر، ۸۵

طنزیہ و مزاحیہ مضامین

آہ مولانا!

(مولانا ابوالکلام آزاد کی روح سے معذرت کے ساتھ)

گزشتہ دنوں حکومت کو اچانک مولانا ابوالکلام آزاد کے یومِ پیدائش کو یومِ تعلیم کے طور پر منانے کا خیال آیا۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں بے شمار چیزیں اسی طرح اچانک وارد ہوتی ہیں اور اسی سرعت سے چلی بھی جاتی ہیں۔ یہ حکم یقیناً لائقِ مبارکباد تھا اس لئے نہیں کہ ایک فارسی مقولہ کی رو سے دیر سے آنے والے درست ہوا کرتے ہیں۔ دیر آید درست آید، (ذرا غور کیجئے، کہ اس مقولہ نے جسے ہندی والوں نے بھی ترجمہ کر کے اپنا لیا ہے، ہمیں کس قدر گمراہ کر رکھا ہے۔) اسی کے سبب ہماری تمام تقریبات تاخیر سے شروع ہوتی ہیں۔ صدرِ جلسہ بغیر کوئی کارنامہ انجام دیئے اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لئے جلسہ گاہ میں تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملک کی آزادی، سماجی تبدیلیاں اور دیگر انقلابات بھی ہمارے ملک میں ذرا جلدی آتے اگر ان انقلابات نے یہ مقولہ سن نہ لیا ہوتا۔ دیگر ممالک میں آنے والے انقلابات فارسی سے نابلد رہے نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے نہ تیل بیچنے کی زحمت اٹھائی اور نہ اقبال کی طرح تاخیر سے آئے۔ بہر حال آمدم برسرِ مطلب، مولانا آزاد کو یوں بھی ہمیں یاد کرنا تھا کہ وہ آزاد

ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم تھے۔ تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے طلبا کو مولانا سے متعارف کروانا ضروری ہے اس کی کئی وجوہات معرض وجود میں آچکی ہیں۔ اول یہ کہ مولانا کی رحلت کو ایک زمانہ ہو گیا اور وہ زمانہ جو انھیں ان کے کارناموں کے حوالے سے جانتا تھا اب بدل چکا ہے۔ نئی پیڑھی کو یہ بتانا ضروری ہے کو آں جناب کون تھے۔ اس ضرورت کو میں نے اس دن شدت کے ساتھ محسوس کیا جب میں نے جونیئر کالج کے ایک طالبِ علم سے پوچھا کہ ُبتاؤ تمہاری نظر میں مولانا ابولکلام آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے؟ ؑ یہاں یہ واضح کر دوں کہ میں شہر ناگپور کے ایک ایسے ادارہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہا ہوں جس کا نام اتفاق سے مولانا کے نامِ نامی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کالج کے طالب علم نے میرے سوال کے جواب کہا : ُمولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ناگپور میں مولانا آزاد ہائی اسکول و جونیئر کالج قائم کیا۔ؑ

دوسرا صدمہ مجھے اس وقت پہنچا جب اس تقریب کی تیاری کے سلسلہ میں میرے ایک دوست نے مجھ سے درخواست کی کہ اسے مولانا آزاد کی ایک تصویر درکار ہے۔ میں نے بلا مبالغہ درجنوں دکانوں کی خاک چھانی اور ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ ُہاں ہے نا!ؑ اور ہر جگہ مولانا آزاد کی تصویر کے پردہ میں اے پی جے عبدالکلام، سابق صدر جمہوریہ ہند بر آمد ہوئے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ یہ مولانا آزاد نہیں ہیں تو کچھ دکانداروں نے دانتوں تلے انگلی دبالی، بعض نے ہماری جہالت کو قابلِ رحم جان کر در گزر کیا (اگرچہ ان کے چہرہ سے چھلکتا ہوا یہ تاثر ہم سے چھپا نہ رہ سکا کہ پڑھے لکھے لوگ اس قدر نادان بھی ہو سکتے ہیں!) بعض اپنی حیرانی کو ظاہر ہونے سے روک نہ پائے: ُکیا بھارت میں ان کے علاوہ بھی کوئی ابوالکلام ہوا ہے؟ؑ اور ہم انھیں یہ کہہ کر چلے آئے کہ ُہاں جنابِ عالی! اب تو اپنے اولین وزیرِ تعلیم کو بھولنے کے لئے پورا بھارت آزاد ہے۔ؑ

ہمیں کسی نے مشورہ دیا کہ آپ مولانا کو غلط جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ آپ کسی

مسلم محلہ میں جائیے ۔وہاں تصاویر کی دکان میں مولانا نہ ملیں تو کسی بک ڈپو میں ضرور مل جائیں گے ۔ایک دکان پر پہنچے تو اس نے مولانا محمد علی جوہر کی تصویر تھما دی ۔ہم نے اسے مولانا ماننے سے انکار کیا تو کہنے لگا : 'پچھلی گلی میں مولانا کے نام پر ایک اسکول ہے وہاں تو اسی تصویر کو رکھ کر مولانا کی جینتی مناتے ہیں، کئی سال سے منا رہے ہیں اور آپ پڑھے لکھے ہو کر کہہ رہے ہیں یہ مولانا نہیں ہیں۔'

ہم نے کہا : 'یہ مولانا ضرور ہیں مگر مولانا آزاد نہیں ہیں۔'

''لیکن مولانا تو ہیں نا؟، اب پرانے زمانے کے ہیں تو آزاد کہاں سے رہیں گے ۔''

دکاندار جرح کرنے لگا تھا۔ہم آگے بڑھ گئے ۔دوسرے بک ڈپو کے مالک نے خبر دی کہ مولانا کی تصویر ملتی کہاں ہے۔لوگ اے پی جے عبد الکلام کی تصویر رکھ کر کام چلاتے ہیں۔ ویسے بھی مولانا آوٹ ڈیٹیڈ ہو چکے ہیں اور لوگ انھیں بھول بھی گئے۔اب تو اے پی جے عبد الکلام کا دور ہے۔

ایک بکڈ پو والے سے پوچھا : آپ کے ہاں آزاد کی۔۔۔

'کون سے آزاد؟ ہمارے ہاں بے شمار آزاد ہوئے ہیں۔مولانا ابولکلام آزاد، اے پی جے عبد الکلام آزاد، محمد حسین آزاد، جگن ناتھ آزاد، چندر شیکھر آزاد، غلام نبی آزاد، قوال یوسف آزاد، یہ آزاد، وہ آزاد، آزادی کے بعد پورا ملک آزاد ہو گیا ہے۔'

'ہمیں مولانا ابو الکلام آزاد کی بڑے سائز کی تصویر چاہیئے۔'

'معاف کیجئے !ان کی کوئی کتاب دیکھئے شاید اس کے کسی کونے میں ان کی تصویر مل جائے ۔بڑی تصویر ہمارے ہاں نہیں ہے۔

ہمیں محسوس ہوا کہ اتنے سارے آزادوں میں مولانا آزاد اس طرح گم ہو گئے ہیں جیسے ہمارے ملک کے ہر شہری کو حاصل ہونے والی ڈھیر ساری آزادیوں میں فرد کی حقیقی آزادی کہیں گم ہو گئی ہے، اور مولانا آزاد کی حقیقی امیج بھی سکڑ گئی ہے ۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

محکمہ تعلیمات کے حکم پر ان دنوں پورے شہر کے اسکول مولانا آزاد کا یومِ پیدائش منانے پر تلے ہوئے تھے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کی یہ فرماں برداری یقینا قابلِ تحسین ہے کہ وہ کسی بڑی شخصیت کی طرف اس وقت تک آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جب تک سرکار اس نابغۂ روزگار کو ان کے لئے 'محرم' قرار نہ دیدے۔ ایک صدر مدرس نے جن کے نامی گرامی اسکول کے نام میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کو شمولیت کا شرف حاصل تھا، مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ ان کے اسکول کا نام مولانا کے نام پر رکھا ہوا ہے اور وہ شہر کا سب سے پرانا ادارہ ہے، اس سال وہ سرکاری حکم پر عمل کرتے ہوئے پہلی مرتبہ مولانا کا جنم دن منانے جا رہے ہیں۔ موصوف نے مزید اطلاع دی کہ اس دن طلباء کے درمیان چاکلیٹ بھی تقسیم کئے جائیں گے اور ایک ریلی نکالی جائے گی۔ بعد میں کسی نے مجھے بتایا کہ اس ریلی میں بچوں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ نعرے بھی لگائے۔ مولانا آزاد۔ زندہ باد، ایک دو تین چار۔ گاندھی جی کی جے جے کار، جے جوان ۔ جے کسان۔ وغیرہ غیرہ (بے چارے معلمین و معلمات بھی مجبور ہیں، نئے نعرے کہاں سے لائیں)۔

ان ہی دنوں شہر کے سماجی فلاحی اداروں کو مولانا بے اختیار یاد آئے اور انھوں نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے۔ ریلی نکالی، ایک میدان میں بڑا جلسہ منعقد کیا۔ مولانا آزاد سے شہر کے سارے طلباء واقف ہوسکیں اس غرض سے بچوں کو مولانا کا گیٹ اپ دیا گیا۔ شیروانی، ٹوپی اور نقلی ڈاڑھی میں ملبوس درجنوں ننھے ننھے، چھوٹے بڑے، دبلے موٹے ہر سائز کے مولانا آزاد ٹرکوں پر کھڑے نظر آنے لگے۔ سارے شہر نے جان لیا کہ مولانا آزاد ایسے ہی تھے۔ ریلی شہر کے دو اداروں نے ساجھے داری میں نکالی تھی۔

میں نے دیکھا ایک ٹرک پر اسکول یونی فارم سفید شرٹ پینٹ میں ملبوس ایک

لڑکے سے مولانا کا بھیس بنائے ہوئے لڑکے کی لڑائی ہو رہی ہے۔مولانا ڈاڑھی لگائے،ٹوپی پہنے اسے ایک پتلی سی لکڑی سے پیٹ رہے ہیں اور مغلظات بکتے جا رہے ہیں۔

کسی نے ایک ٹیچر سے کہا: 'ارے یہ کیا ہو رہا ہے،روکو ان کو'،تو ٹیچر کہنے لگا: 'بھئی! وہ بھی اس جھلکی کا حصہ ہے۔یہ دکھایا جا رہا ہے کہ مولانا نے کس طرح اپنے قلم اور تقریر سے انگریزوں کے خلاف جنگ کی تھی۔'

دوسرے ٹرک پر دو مولانا آپس میں گتھے ہوئے تھے۔اس کے متعلق ان صاحب سے پوچھا گیا تو فرمایا: دراصل یہاں یہ بتانا ہے کہ مولانا آزاد اپنی ابتدائی زندگی میں خود اپنے آپ سے الجھتے رہتے تھی۔کتنے ہی مذہبی معاملات میں ان کے دل و دماغ میں جنگ چلتی رہتی تھی۔مولانا کے اندر خود دو مولانا ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے تھے،یہ اسی کا نقشہ ہے۔

جب ہم میدان میں پہنچے تو دیکھا ہر طرف جوش و خروش کا ماحول ہے اور اس میں مزید جوش پیدا کرنے کے لئے فلمی گیت بجائے جا رہے تھے۔ہمارے کانوں میں پہلے بول پڑے وہ یہ تھے۔

اس دھرتی پہ جس نے جنم لیا،اس نے ہی پایا پیار ترا،یہاں اپنا پرایا کوئی نہیں،
ہے سب پہ ماں اپکار ترا
میرے دیش کی دھرتی سونا اگلے اگلے ہیرے موتی۔

ہم نے اردو میڈیم اسکول کے ایک استاد سے جو باریش تھے اور ٹوپی پہنے ہوئے حلیہ سے نیم مولانا نظر آ رہے تھے پوچھا: 'یہ مخصوص گیت بجانے کا یہ کیا موقع ہے؟'
کہنے لگے،'ارے صاحب! مزہ آتا ہے خوشی کا موقع ہے،آج مولانا کا یومِ پیدائش ہے۔'

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

'مگر یہ میرے دیش کی دھرتی؟'

جناب بات دراصل یہ ہے کہ مولانا آزاد، جیسے عظیم لوگ یہاں پیدا ہوئے ہیں، اور مولانا آزاد تو سونا تھے، چوبیس کیریٹ سونا۔

مولانا آزاد کی جائے پیدائش پر نیا تنازعہ پیدا ہو جانے کے ڈر سے ہم آگے بڑھ گئے۔

شہر کے سب سے بڑے گراؤنڈ میں تمام اردو اسکولوں کے طلبا و طالبات کو جمع کیا گیا تا کہ انھیں مولانا آزاد کی خدمات سے واقف کروایا جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں تقریب کا آغاز ہو گیا۔ تقریر کرتے ہوئے مقررِ خاص نے کہا: مولانا آزاد کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے، وہ ہمارے عظیم رہنما تھے۔ انھوں نے جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔'

ایک بچہ مولانا کے بھیس میں کھڑا بڑے انہماک سے تقریر سن رہا تھا مجھے محسوس ہوا، وہ بچہ ~~نہیں خود مولانا ابوالکلام آزاد ہیں اور اپنے بارے میں قوم کے خیالات~~ سننے کے لئے زمین پر دوبارہ اتر آئے ہیں، مگر مقررِ خصوصی نے انھیں تین جملوں میں نمٹا دیا اور پھر بتانے لگا کہ ان کی تنظیم نے شہر میں کیا کیا کارنامے انجام دئے۔ مولانا اپنے بارے میں سننے کے لئے ترستے رہ گئے۔

جلسہ کے بعد اس مقرر کو کئی لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ 'تم نے مولانا کے بارے میں اتنا کم کیوں کہا؟'

'ارے کیا بولتا، مجھے اس سے زیادہ کچھ معلوم ہی نہیں۔ وہ تو اچھا ہوا ماسٹر صاحب نے وقت پر تین جملے گھسیٹ دئے تو جم گیا۔'

دوسری تنظیم کے صدر نے اس کا گریبان پکڑ لیا : تم نے میرا تعارف کیوں نہیں کروایا۔ ہماری پارٹی کے بارے میں تو کچھ بولا ہی نہیں۔ بس اپنی بے تکی ہانکتے رہے۔' اس کے بعد اس کی تنظیم کے صدر نے اسے آڑے ہاتھ لیا۔ 'سب سے پہلے یہ بتاؤ

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

تم نے میرا تعارف کیوں نہیں کروایا۔ایک صاحب وہیں اناؤنسر کو ڈانٹ پلا رہے تھے
کہ مجھے تقریر کے لئے مائک پر کیوں نہیں بلایا؟

اس غبارِ خاطر کے سبب ہنگامہ بڑھنے لگا تو ہم نے اپنا راستہ لیا۔ بچے بھی مولانا آزاد کو تین
جملوں میں خراجِ عقیدت پیش کر کے گھروں کی طرف چل دیے۔

ٹوپی کے متعلق

اس چارگرہ کپڑے کی قسمت واقعی قابلِ رشک ہے جوٹوپی میں ڈھل کر کسی کے سر چڑھ جائے اور اسے جادو بن کر بولنا بھی نصیب ہو۔سر چڑھی تمام چیزوں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بولتی ضرور ہیں۔خواہ وہ بیوی ہو،لیڈر ہو یا ٹوپی۔ہمارے ہاں ٹوپی کی باضابطہ تعریف کہیں نہیں ملتی۔اس کی تعریف کا مرحلہ آتے ہی یہ کرشمہ رونما ہوتا ہے کہ ٹوپی اپنی جگہ رہ جاتی ہے اورٹوپی پہننے والے ہی کی تعریف شروع ہو جاتی ہے۔سر کی حفاظت یا شخصیت کی تزئین کاری کے علاوہ بھی ٹوپی کے بے شمار فائدے ہیں۔

دماغ ہمارے جسم میں سب سے اونچے مقام پر واقع ہوا ہے۔ایسے بلند و بالا مقام پر پائے جانے والے لوگوں کی طرح وہ جتنا نازک ہے اتنا ہی خطرناک بھی ہے۔انسانی جسم میں دماغ کی حفاظت کی خاطر سر بنایا گیا ہے اور لگتا ہے،کہیں ادھر ادھر پھر نہ جائے اس غرض سے اسے ٹوپی اور پگڑی کی صورت میں مزید تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔اس کے باوجود سر تو سر ٹھہرا! اس کے اندر یا اس پر سوار چیزوں میں کب کیا انقلاب رونما ہوگا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

یہی حال ٹوپی کا بھی ہے۔نہیں معلوم ٹوپی سے کب کیا برآمد ہو جائے۔کبھی ٹوپی سے کبوتر نکل آتے ہیں اور کبھی سونے کے انڈے۔گزشتہ زمانہ میں کبوتر پیغام رسانی کے

کام آتے تھے۔فی زمانہ ذرائع ابلاغ کی پھیلائی ہوئی باضابطہ بدامنی کو دیکھتے ہوئے کبوتروں کو اس خدمت سے سبک دوش کر دیا گیا ہے۔اب کبوتروں کو صرف دانہ ڈالا جاتا ہے،تفریح کے لئے اڑایا جاتا ہے اور امن کی علامت کے طور پر ادب اور تصاویر میں استعمال کیا جاتا ہے۔

سیاسی جادوگر ٹوپیوں سے کبوتر اور سونے کے انڈے برآمد کرتے ہیں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ امن کے سوداگر ہیں۔اس سودے بازی میں وہ سونے کے انڈے خود رکھ لیتے ہیں، کبوتروں کو مسجدوں، مندروں اور تاریخی عمارتوں کے سامنے چھوڑ دیتے ہیں۔جنتا ان کبوتروں کو دانے کھلا کھلا کر ثوابِ دارین حاصل کرتی رہتی ہے۔

سیاسی رہنما سونے کے انڈے پہلی فرصت میں اپنے سوئٹزرلینڈ کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرکے اپنی مالی حالت بحال کر لیتے ہیں کیونکہ اس کے بعد انھیں صرف ووٹوں کی بھیک مانگنی ہوتی ہے۔ٹوپی اس مقصد میں بھی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔

ہم نے دیکھا ہے بعض فقیر دامن پھیلا کر بھیک مانگتے ہیں، کچھ اپنی ٹوپی کو الٹا کرکے، ہاتھوں میں کٹورے کی طرح تھام کر اس میں بھیک کی رقم جمع کرتے ہیں بعض لوگ ٹوپی کو اپنے سر پر سجا کر بھی یہ مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔

ٹوپیوں کا زیب تن کرنا کہیں تو رسم و رواج کا مرہونِ منت ہے، کہیں موروثی ہے، کہیں اختیاری ہے اور کہیں مجبوری !

عام خیال یہ ہے کہ عبادت کرتے ہوئے ٹوپی پہننا اور تجارت کرتے ہوئے ٹوپی پہنانا ضروری ہے، حالانکہ اگر آپ سچائی اور خلوصِ دل کے مالک ہیں تو اس کے بغیر بھی یہ دونوں کام انجام دیے جاسکتے ہیں۔

وقت اور عمر کے تقاضے ہمیں اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں جہاں ہم اپنے آپ کو بے اختیار پاتے ہیں۔کئی چیزیں بادلِ ناخواستہ اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ٹوپی بھی ان

میں سے ایک ہے۔آخری عمر میں بال و پر سے بے نیاز ہونے کے بعد، سر کے اسرار سر بستہ چھپانے کے لئے ہمیں ٹوپی کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ اس مجبوری کو بعض لوگ شریکِ حیات کی طرح اس خوبی سے نبھاتے ہیں کہ ٹوپی ان کی ذات کا جزو لاینفک بن جاتی ہے۔لگتا ہے وہ پیدا بھی ٹوپی پہن کر ہی ہوئے تھے۔اس کے برعکس کچھ لوگ جو ذرا الگ قسم کے دھاروں میں بہنے کے عادی ہیں، ان کے سروں میں عجیب وغریب قسم کی ہوا بھری ہوئی ہوتی ہے، اسی لئے وہ مختلف سُروں میں نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ان کے سر پر نہ کوئی ٹوپی ٹکتی ہے، نہ وہ ٹوپیوں کے درمیان خود کو کبھی ٹکنے دیتے ہیں۔وہ ٹوپیوں سے اس قدر بیزار ہوتے ہیں کہ کوئی پہنانے کی کوشش کرے تو برا مان جاتے ہیں۔

عام طور پر دوسروں کو ٹوپی پہنانے والا ٹوپی کی حقیقت سے باخبر ہوتا ہے اسی لئے وہ خود کبھی ٹوپی نہیں پہنتا۔اسی قسم کے ایک رہنما کو جب، ایک تقریب میں استقبال کے دوران منتظمین نے، شال، گل دستہ پیش کیا اور ٹوپی پہنائی تو انھوں نے اپنی تقریر کے دوران یہ مشورہ دیا کہ آئندہ جلسہ میں ایک عدد مصنوعی ڈاڑھی بھی مہمانوں کی خدمت میں پیش کی جائے ۔کسی زمانے میں ڈاڑھی اور ٹوپی میں گاڑھی چھنتی تھی ۔ وقت نے اس چھلنی میں اتنے سوراخ پیدا کر دئے کہ کبھی اس سے ڈاڑھی باہر نکل گئی، کبھی ٹوپی اور کبھی صرف خالی چھلنی رہ گئی۔

ٹوپی کی پہلی منزل انسان کا سر ہے اور آخری ٹھکانہ ہینگر جہاں وہ دنیا بھر کا سفر طے کر کے لوٹنے کے بعد لٹکا دی جاتی ہے۔ہم میں سے بیشتر افراد کی شخصیت بھی اندر والا اور باہر والا، ان دو خانوں میں منقسم ہوا کرتی ہے ۔جب آدمی باہر سے گھر میں داخل ہوتا ہے تو اس کی بیرونی شخصیت تھک کر چور ہو جاتی ہے اور بعض اوقات گھر میں قدم رکھتے ہی چور چور ہو جاتی ہے ۔قدیم زمانے میں لوگ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے قائل تھے، موجودہ زمانے میں لوگ اتنی ہی شخصیتیں پالتے ہیں۔گھر آ کر نمائش سے تھک کر چور

شخصیت کو آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے اسے ٹوپی کی صورت اتار کر ہنگر پر لٹکا دیتے ہیں۔

ابھی ابھی تک ٹوپی کا استعمال مسجد کے لئے تھا اب مسجد تک محدود ہو گیا ہے۔ مسجد سے نکلتے ہی بعض لوگ شرافت کے ساتھ ٹوپی اتار کر جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ بعض مسجدوں میں نمازیوں کے لئے ٹوپیاں رکھی ہوتی ہیں۔ اکثر نمازی عادت کے مارے وہی ٹوپیاں پہن کر گھر چلے جاتے ہیں۔ اکثر یہ سوچ کر کہ مسجد کی برکت گھر تک آ گئی ہے تو کیا لوٹائیں۔ اس قسم کی ٹوپیاں لوٹ کر مسجد نہیں آتیں، ان نمازیوں کی طرح جو عید کی نماز پڑھ کر دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ اسی لئے بعض مساجد کی ٹوپیوں پر جلی حرفوں میں لکھا ہوتا ہے۔ یہ ٹوپی مسجد کی ہے۔

ٹوپی تہذیب کی علامت ہے۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہماری تہذیب ٹوپیوں کی تہذیب ہے اسی لئے اس کا اتار پھینکنا اس قدر آسان ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ٹوپی، بیوی اور جوتی کے بغیر آدمی کی شرافت مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت عام طور پر بیوی اور جوتی پیروں تلے رکھی جاتی تھی اور ٹوپی سر پر۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب دنیا بھر کی مصیبتیں ہمارے سر پر آباد نہیں ہوئیں تھیں۔ ان کے آنے کے بعد زندگی کے نازنخروں اور تقاضوں نے ہمیں وہ تگنی کا ناچ نچایا کہ سر کے بال 'پھر ملیں گے اگر خدا لایا'، کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ہم نے بھی ٹوپی اتار کر ان تازہ واردانِ بساطِ سر کے لئے جگہ خالی کر دی کہ تشریف رکھئے۔ اسی لئے آجکل لوگوں کے سروں پر ٹوپیاں نظر نہیں آتیں، جگہ جگہ چاندنی چوک دکھائی دیتے ہیں۔

کوئی دوراندیش اس موقع پر یہ کہہ سکتا ہے کہ سر پر ٹوپی نہیں تو کیا ہوا۔ ٹوپیوں کا سایہ تو ہے۔ ظاہر ہے ہم سائے ہی کی غرض سے ٹوپی زیبِ تن کرتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ اب یہ سایہ بھوت پریت کا سایہ ثابت ہونے لگا ہے۔ جسے ثابت کرنا بڑا

دشوار بلکہ ناممکن ہے، اسے صرف برداشت ہی کیا جا سکتا ہے، سو بیچارے لوگ کر ہی رہے ہیں۔ یہ وہ صورتحال ہے جس میں اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔

گزشتہ دنوں ایک بزرگ ہمارے سر سے ٹوپی غائب دیکھ کر اپنا سر پیٹنے لگے کہ لوگوں کے سر سے ٹوپیاں غائب ہو رہی ہیں نہ جانے قیامت کب آئے گی۔ ہم نے ان کے اس استعجاب کو استفسار سمجھ کر جواباً کہہ دیا۔ 'حضرت! یہ تو نہیں معلوم کہ اب کب آئے گی، البتہ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے، تقریباً روز ہی آیا کرتی تھی۔'

دورِ حاضر میں ہم اپنے سر پر سوار ٹوپیوں کو طوعاً و کرہاً ہی سہی، اس قدر بھگت رہے ہیں کہ مسندوں اور کرسیوں پر براجمان ٹوپیوں کو اتار پھینکنے سے عاجز ہیں تو مارے جھلاہٹ کے اپنے سر کی ٹوپی ہی اتار پھینکی۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔

کبھی تو یوں ہوا کہ ٹوپیوں نے اپنے کارناموں سے انسان کی عزت و توقیر میں اضافہ کیا، اور کبھی ٹوپیوں نے اپنے کرتوت سے انسان کی مٹی پلید کی۔ کچھ سروں پر بظاہر نیک نامی کی ٹوپیاں ہیں تو کچھ ٹوپیاں حقیقت میں دھرتی کا بوجھ ہیں۔ جتنے سر اتنی ٹوپیاں۔ اصل چیز سر ہی ہے۔ ایک محاورے کے مطابق سر سلامت تو ٹوپیاں ہزار۔ اسی لئے اب ٹوپیوں سے زیادہ سروں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ زیب داستان کے لئے استعمال ہونے والی یہ چیز اسی لئے اب داستانِ پارینہ کا درجہ اختیار کرنے لگی ہے۔

ابھی ابھی تک سماج میں ٹوپیوں کی عزّت و وقار کا وہی عالم تھا، لوگ عام طور پر انھیں سروں پر اٹھائے پھرتے تھے تاکہ ٹوپیوں کو جو عزت اور شہرت وراثت میں ملی ہے، پہننے والے کو بھی، اس اس کا کچھ حصہ نصیب ہو جائے۔ گویا ہمارے بزرگوں نے جو کارنامے انجام دئے ہیں ان سے ٹوپیوں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ اور اب ہم عزت و توقیر کے وہی چیک حاملِ چیک BEARER بن کر بھناتے پھر رہے ہیں۔

کبھی ٹوپی سے آدمی کی شناخت ہوئی ہے اور کبھی آدمی سے اس کی ٹوپی پہچانی

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

گئی۔ کارزارِ زندگی میں آدمی اور اس کی ٹوپی قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ اس سفر میں کبھی یوں ہوا کہ آدمی پیچھے رہ گیا، اس کی ٹوپی آگے نکل گئی۔ سر پر ٹوپی سوار تھی اس لئے اس مسافر کی پول نہ کھلی۔ لوگوں نے عبا و قبا کے فریب میں آ کر، اس کے اندر موجود ہستی کا جائزہ لینا ضروری نہ سمجھا۔ البتہ تاریخ میں بارہا ایسا بھی ہوا کہ آدمی کی تساہل پسندی اور بدکاری نے مل کر وہ گل کھلائے کہ وہ سیاہ کار بلا فرمائش، عبا و قبا سے حالتِ عریانی میں باہر نکل آیا۔

آج کل ٹوپیوں کی تعداد میں حیرت انگیز کمی، دراصل عزت دار ٹوپیوں کی، بدکاروں کی بستی سے روپوشی سے عبارت ہے۔

ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، ۲۰۱۵

ڈاکٹر بنے تھے یگانہ

جمال صاحب آفس میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے کاندھے پر نہایت ہلکا پھلکا سا ایک بیگ ہوا کرتا ہے۔ جس ٹیبل پر انھیں تعینات کیا گیا ہے، مجھے مقرر کیا جاتا تو اس کے فرائضِ منصبی کے بوجھ تلے دب کر کب کا مر کھپ گیا ہوتا یا وی۔آر۔سی لے لیتا، یعنی اپنی مرضی سے وظیفہ یاب ہو جاتا۔ (اگلے وقتوں میں لوگ فکروں اور پریشانیوں سے بوڑھے ہو جایا کرتے تھے فی زمانہ وی آر سی لے کر اہلِ خانہ کو بوڑھا ہونے میں مدد کرتے ہیں)۔ قربان جائیے جمال صاحب کے، وہ سبک سا بیگ جسے عرفِ عام میں جھولا کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ انھوں نے کبھی اپنے کاندھے پر کچھ ٹکنے ہی نہ دیا۔

آفس میں پہنچتے ہی، (خواہ جب بھی پہنچیں)، وہ سب سے پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ اس سارے جہاں کے بوجھ کو اس طاق میں لے جا کر رکھ دیتے ہیں جہاں پہلے ہی انھوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کے کام رکھ چھوڑے ہیں۔ آفس حیران ہے کہ جب وہ صحیح معنوں میں سبک دوش ہوں گے، تو اس موقع کے مقررین (جو ابھی سے طے شدہ ہیں) کس منہ سے کہیں گے کہ جمال صاحب آج اپنے فرائض سے سبک دوش ہو گئے۔ ان کے معاملے میں تو یہ اصطلاح بے معنی ثابت ہو گی۔ ہاں اس سے مراد اگر صرف وہ جھولا ہو تو بات الگ ہے۔

ایک دن جمال صاحب میرے بھاری بھرکم بیگ کو دیکھ کر کٹیلے انداز

میں مسکرائے۔ ان کا مسکرانا ایسا ہی تھا جیسے کوئی دبلا پتلا آدمی کسی سومو پہلوان کو اچانک دیکھ لے۔ میں اپنے اس بیگ میں ٹفن، یعنی غمِ دوراں اور بیگم کی عطا کردہ شاپنگ کی لسٹ یا شاپنگ کے بعد تبدیل کرنے کے لئے دی گئی اشیا وغیرہ یعنی غمِ جاناں اور نہ جانے الابلا قسم کے دنیا بھر کے غم لے کر چلتا ہوں۔

جمال صاحب کی مسکراہٹ بھی ان ہی کی طرح باتونی تھی، ان کے دل کا سارا ماجرا بیان کر گئی، جب ان کا دل اس پر بھی نہ بھرا تو کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب آپ کا یہ وزنی بیگ آپ کو پریشان نہیں کرتا؟

'نہیں جناب! میں نے جواباً کہا اس کے لئے ہمارے سینیئر آفیسرس ہیں نا۔'

فلک شگاف قہقہہ لگا کر کہنے لگے۔'واہ صاحب! آپ بھی ہمارے ساتھ رہ کر جملے بنانا سیکھ ہی گئے۔'

'ڈاکٹر صاحب! آپ بھی میری طرح ہلکا پھلکا سا بیگ کیوں نہیں خرید لیتے؟'

میں نے کہا خرید تو لوں مگر ڈرتا ہوں کہیں لوگ مجھے 'جھولا چھاپ ڈاکٹر' نہ کہنے لگیں۔

مجھے امید تھی کہ یہ بے ضرر سا جملہ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچائے گا کیونکہ وہ کسی بھی زاویہ سے ڈاکٹر نہ تھے، مگر اپنے جھولے کی شان میں وہ اتنی بڑی گستاخی برداشت نہ کر سکے اور خاموش ہو گئے۔ میں ان کی خاموشی کی تاب نہ لا پایا مگر اب تیر کمان سے اور جمال صاحب کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیتے ہی ہمارے نام کے ساتھ لفظ ڈاکٹر کسی تہمت کی طرح جڑ گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، نہ جانے کتنی خوش گمانیوں اور بدگمانیوں کی مار جھیل رہے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اسی کے طفیل سماج میں ہمیں ایک مقام بھی حاصل ہوا۔ اب جس انداز اور جس رفتار سے یہ لفظ اسکالرس کے ساتھ استعمال ہونے لگا ہے اس نے اس لفظ کی وقعت گھٹا دی ہے۔ بعض لوگ جو طبیب بن کر ڈاکٹر کہلانے کی ہمت نہیں کر پاتے

ادیب یا محقق یعنی اسکالر بن کر اس اعزاز کے حقدار بن جاتے ہیں۔ آج تعلیم یافتہ طبقے میں اس کے حصول کی ایک لہر سی چل پڑی ہے۔

ادبیات میں ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کی ہوس سے اپنے آپ کو بچا پانا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ادب کا ہر ڈاکٹر اس برتے پر ڈگری کالج میں نوکری پانے سے رہا، نہ اس سے نچلے درجے کی تعلیم گاہوں میں تنخواہوں میں اضافے کے امکانات ہیں۔ اس کے باوجود لوگ اس موہ مایا سے اپنے آپ کو نہیں بچا پاتے تو اس کا اہم سبب یہ ہے کہ کچھ ہو نہ ہو لوگ آپ کو ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں یا نیم پلیٹ پر یا دستخط کے نیچے جب آپ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھتے ہیں تو اس ڈگری کے حاصل کرنے کے لئے جو قارون کا خزانہ لٹایا ہے یا ہفت خواں آپ نے طے کئے ہیں، اس کی ساری کلفت دور ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر بننے کے جو دو راستے ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، آجکل ان میں سے کسی ایک کے ذریعے بھی آپ گوہرِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ نہ جانے کیوں ہمیں رہ رہ کر یہ خیال ستاتا ہے کہ میڈیسن کے ڈاکٹر کے نام کے ساتھ تو لفظ ڈاکٹر لگتا ہے، باقی کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے کے بعد ہونے والی خوشی تو وہی جانتا ہے جسے یہ سعادت نصیب ہو۔ اپنی سطح پر تو اسے محسوس ہوتا ہے گویا اسے بھارت رتن یا پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا لیکن جس طرح ابتدا میں نئے کپڑوں کی مہک طبیعت میں سرور پیدا کرتی ہے، دھیرے دھیرے آپ اسے ضرورتاً پہننے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہ لگنے لگتا ہے کہ آپ ان کپڑوں کو پہن نہیں رہے ہیں اوڑھ رہے ہیں۔

اگر آپ موجودہ دور کی دانش گاہوں کے محرمِ رازِ درونِ خانہ ہیں تو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ لفظ ڈاکٹر کی ساکھ دن بہ دن کیوں گر رہی ہے۔ اس گراوٹ نے تو روپیے کی قیمت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ایک دور وہ بھی تھا کہ اپنے نام کے ساتھ اس لفظ

ڈاکٹر لگانا باعثِ شرف تھا، اب اس کا استعمال دہشت پیدا کرتا ہے۔ یہ لفظ اب شک کے گھیرے میں آ گیا ہے۔ اسی لئے اگر آپ بھی ادب کے ڈاکٹر ہیں تو دیکھنے والا آپ کو بھی پہلی بار اسی بری نظر سے دیکھتا ہے (یہ اور بات ہے کہ از روئے شریعت نامحرم پر پڑنے والی پہلی نظر معاف ہے) آپ اپنی پاک دامنی کے دفاع میں اور اپنی صفائی میں جھینپنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟

اس میدان میں دہشت پھیلانے والے مجاہدین بے خوفی سے شب خون مارتے ہیں، مالِ غنیمت کو سرِ عام تقسیم کرتے ہیں۔ کچھ نہ کر کے بھی ڈرنا معصوموں کا مقدر ہے اور اپنے کرتوت پر نہ شرمانا نئے زمانے کا فیشن اور خود اعتمادی کا ضامن بھی۔ یہی سبب ہے کہ اب بعض لوگ لفظ ڈاکٹر کو اپنے نام کے ساتھ کتاب کے سرِ ورق پر سجاتے ہیں وہیں کچھ اس سے اپنا دامن بھی بچاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی آپ کو ملیں گے جو اپنے نام کے ساتھ لفظ ڈاکٹر کا استعمال کرنا کم ظرفی سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ لفظ ڈاکٹر کا استعمال نہ کرنے پر کچھ اس طرح کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں جیسے آپ کے پاس معقول سواری ہو اور پھر بھی آپ پیدل چلے جا رہے ہیں۔

پچھلے دنوں اس آگ میں تیل اس وقت پڑ گیا جب بعض اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے پر ایک صاحب نے اپنے نام کے آگے ڈاکٹر لکھ لیا (کسی کا یہ اعتراض تھا کہ یہ شخص تو سادہ سا میٹریکولیٹ بھی نہیں ہے، اسے ڈاکٹر کہنا کیوں کر مناسب ہے) لفظ ڈاکٹر کا سابقہ جوڑ کر آپ خواہ مخواہ انٹیلیکچول، فلاسفر اور اسی قسم کے لوگوں کے زمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے تو آپ کے ساتھ خواہ مخواہ دانشوری کی کچھ توقعات وابستہ ہو ہی جاتی ہیں، بھلے ہی آپ ان پر کھرے اتریں نہ اتریں۔ بقول دلاور فگار: و دیس سے آنے والے بتا، کیا اب بھی وہاں ہر گنجا سر اسکالر سمجھا

جاتا ہے؟

ان ڈاکٹروں کا کیا حال ہے وہ بھی سنا دیں۔

ڈگری کالج کی ایک اسامی کے لئے انٹرویو کے لئے جب ہم پہنچے تو دیکھا ایک پوسٹ کے لئے بائیس ڈاکٹر موجود ہیں۔ایک صاحب گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے سوالات رٹ رہے ہیں۔ایک ڈاکٹر صاحب سے ہم نے یوں ہی پوچھ لیا، 'آپ کی تحقیق کا موضوع کیا تھا؟' کہنے لگے 'ایسا ہی کچھ تھا۔ مجھے تو یاد بھی نہیں۔' پھر انھوں نے اپنے جھولے سے ایک فائل نکالی اور ہمارے سوال کا صحیح جواب دیا۔

ایک مرتبہ ایک محترمہ کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے پر شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا۔ڈاکٹر صاحبہ نے تقریر کے دوران اپنی فتوحات بیان کرتے ہوئے کہا : 'جو تحقیقی کام میں نے کیا ہے کتنا بڑا ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیے کہ میرے تحقیقی مقالے کا عنوان ہی خود اتنا مشکل ہے کہ میں آپ کے سامنے بغیر دیکھے پڑھ کر سنا بھی نہیں سکتی، وہ تو میرے گائیڈ ہی آپ کو بتائیں گے۔ میں اپنے گائیڈ کا شکریہ ادا کرتی ہوں، جنھوں نے قدم قدم پر مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔' ہم بہر حال موصوفہ کی ذہانت کی داد دیں گے کہ اس موقع پر انھوں نے قدم قدم پر دیے گئے ان قیمتی مشوروں کی قیمت بتانے سے گریز کیا۔

لفظ ڈاکٹر کی افادیت کا میں اس دن سے قائل ہوں جب میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن سگنل کراس کرنے پر ٹرافک انسپکٹر نے مجھے روکا۔ میں اسے اپنی زبان میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس زبان کا قائل ہی نہیں ہے۔ وہ سرکار کا بندہ تو صرف اسی زبان کو سمجھتا تھا جس پر سرکاری مہر ہو۔ اسی دوران جب سواریوں کا ایک ریلا سڑک سے گزرنے لگا تو ایک صاحب نے جو مجھے جانتے تھے، اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے مجھے اس کس مپرسی کی حالت میں دیکھا تو وہیں سے

آواز لگائی: 'ڈاکٹر صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟' اور آگے بڑھ گئے۔ اس کانسٹیبل نے یہ سنا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔
آپ ڈاکٹر ہیں؟
میں نے کہا، 'تم نے سنا نہیں؟'
'آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا،'
'تم نے موقع ہی کب دیا؟'
'کوئی بات نہیں، آپ جائیے، ہم ڈاکٹروں کو پریشان نہیں کرتے۔'
ہم کس قسم کے ڈاکٹر ہیں، اس راز کی وضاحت کا وہ موقع نہیں تھا اور خلافِ مصلحت بھی۔ ہم اس کا شکریہ ادا کر کے چلتے بنے۔

میڈیکل ڈاکٹر نہ ہوتے ہوئے ڈاکٹر کہلانے کے فائدے کم اور مصیبتیں زیادہ ہیں۔ کل ہی کی بات لیجئے بیگم نے ہمیں بتایا کہ 'گھر کا کام کرنے والی بائی آپ سے کہہ رہی تھی کہ اس کے بچّے کے پیٹ میں درد ہے اور ہلکا ہلکا سا بخار بھی ہے۔' ہم نے حیرت اور گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ 'ہم اس بائی سے اتنے بے تکلف تو ہیں نہیں کہ وہ ہمیں اپنے گھریلو معاملات میں شریک کرے۔'
بیگم نے کہا۔ 'وہ تو مجھے بھی پتہ ہے، مگر وہ چاہتی ہے کہ آپ اسے کوئی دوائی دیدیں۔'
'تم نے اسے سمجھایا نہیں کہ ہم خدانخواستہ اس قسم کے ڈاکٹر نہیں ہیں؟'
'سمجھایا، مگر اس نے آپ کی نیم پلیٹ پر لکھا ہوا ڈاکٹر پڑھ لیا ہے اور وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ آپ اسے بغیر فیس لئے دوائی دینے سے بچنا چاہتے ہیں، وہ آجکل کے ڈاکٹروں کو جانتی ہے نا۔

ہم جیسے ادب کے ڈاکٹروں کو لوگ سمجھیں نہ سمجھیں مگر بچہ بچہ ہماری حقیقت سے واقف ہے۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

ایک مرتبہ چھٹیوں میں ہمارے چند عزیزوں کے بچے بطور مہمان ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ایک شریر بچی کو ڈرانے کے لئے کسی نے کہہ دیا،'تم زیادہ شرارت کروگی تو ڈاکٹر انکل سے انجکشن لگوادیں گے۔'

وہ کہنے لگی۔'مجھے نہ بناؤ، انکل سوئی والے ڈاکٹر تھوڑا ہی ہیں۔'

'پھر کون سے ڈاکٹر ہیں؟' ننھے عمیر نے پوچھا۔

'وہ تو کتابوں کے ڈاکٹر ہیں؟'

'وہ کیا کرتے ہیں؟'

'ارے جب کوئی کتاب پھٹ جاتی ہے تو اسے گوند لگا کر ٹھیک کر دیتے ہیں۔'

نشہ خودی کا چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، اکتوبر ۲۰۱۲

مہمانوں کا سیلاب

مہمان نوازی کی روایت بہت پرانی ہے ۔صدیوں کے اس سفر میں مہمان بننے اور بگڑنے کے کئی مراحل سے گزر چکا ہے ۔اس دوران اس نے میزبان کو سبق سکھایا ہو نہ ہو اس سے نمٹنے کا گر ضرور سیکھ لیا ہے ۔اب مہمان یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کب کس میزبان کو فون پر اطلاع دے کر اسے اس کے گھر میں پابہ زنجیر کرنا ضروری ہے اور کہاں اچانک بارش کی طرح جادھمکنا چاہئے کہ میزبان کو نہ بھاگنے کی مہلت ملے نہ رستہ۔

بعض لوگ گھر میں قدم رکھتے ہی یہ پتہ لگا لیتے ہیں کہ گھر میں کس قسم کا نظامِ حکومت رائج ہے ۔شوہر کے جہانِ دل پر بیگم کی حکومت ہو تو چائے اور کھانوں کی لگاتار تعریف میزبان کے دل اور گھر دونوں میں جگہ بنانے کے لئے کافی ہے ۔گھر میں میاں کا سکہ چلتا ہو تو اسکے بچوں یا کتوں (جو بھی زیادہ عزیز ہو) کو سراہنا گھر میں ٹکے رہنے کے لئے ضروری ہے ۔مہمان بارش کے قطرہ کی طرح تنہا نہیں آتا ۔بھلا بارش اپنے قطروں کو کسی اور مقام پر چھوڑ کر کیسے آسکتی ہے ۔مہمان جب آتا ہے تو میزبان مرزا غالبؔ کی زبان میں کاتبِ تقدیر سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھتا رہ جاتا ہے ۔

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

گرمیوں کی تعطیلات میں پانی کی قلت اور شادیوں کی کثرت عام ہے ۔ ہمارے علاقے میں شادی کے دعوت ناموں پر یہ شعر بھی لکھا جاتا ہے۔

اے بادِ صبا کچھ تو نے سنا مہمان جو آنے والے ہیں
کلیاں نہ بچھانا راہوں میں ہم پلکیں بچھانے والے ہیں

بس اس شعر کو پڑھ کو مہمانوں کا سیلاب امڈ پڑتا ہے۔عزیز واقارب کوشادی میں مدعو کرنا میزبان کی مجبوری ہے کہ اسی رسمِ دنیا کو عزت سپلائی کرنے کا ٹھیکا سماج کی جانب سے ودیعت ہوا ہے ۔ وہ غریب دل ہی دل میں ڈرتا ہے کہ تمام مہمانوں کو دعوت دی گئی اور سب شریک ہو گئے تو مہمانوں کا یہ سیلاب دیکھ کراس کی آنکھیں مارے حیرت کے کتنی ہی کیوں نہ پھیل جائیں، پلکیں اس قدر ہر گز وسیع نہیں ہوسکتیں کہ ان پر تمام لوگ سما سکیں۔

بعض میزبان اس صورتِ حال کوٹالنے کے لئے دعوت نامے اس خوبصورتی سے پوسٹ کرتے ہیں کہ نکاح ۳۱ مارچ کو ہے تو دعوت نامہ ایک اپریل کو مہمان کے ہاتھ لگے تاکہ مہمان بن کر میزبان کے سینے پر مونگ دلنے کی خواہش کے باوجود مہمان اس قابل نہیں رہ پاتا کہ وہاں پہنچ سکے۔اس صورت میں رقعے پر درج شعر کا مقصد مہمانوں کو مدعو کرنا نہیں بلکہ بادِ صبا کو اطلاع دینا ہے کہ اے بادِ صبا! ہم نے مہمانوں کا معقول بندوبست کر دیا ہے تم خواہ مخواہ راہوں میں کلیاں بچھانے کی زحمت کیوں کرو؟

مہمان سیلاب کی طرح آتے ہیں یا نہیں اس میں دو رائیں ہوسکتی ہیں لیکن اس سے کون انکار کرے گا کہ سیلاب مہمان کی طرح آتا ہے اور شرعی مہمان یا معمولی بخار کی طرح تین دنوں میں اتر بھی جاتا ہے البتہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ مہمانوں کی طرح آنے والا سیلاب زیادہ تباہی پھیلاتا ہے یا سیلاب کی طرح آنے والے مہمان۔

ہم اپنی روح کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں تو محسوس کریں گے کہ مہمانوں کی خاطر مدارات سے ہمیں ہزار دقتوں کے باوجود ایک عجیب سی روحانی خوشی ضرور ہوتی ہے۔

مہمانوں کے قدرداں نکاح کے رقعوں پر مذکورہ شعر لکھوائے بغیر بھی مہمانوں کی راہ میں پلکیں بچھائے رہتے ہیں۔ مہمان شکم سیر ہو جائے تو میزبان کی روح سیراب ہو جاتی ہے۔ البتہ ان دنوں یہ ہونے لگا ہے کہ مہمان کے رخصت ہوتے وقت میزبان کے ہونٹوں پر سہما سہما سا ایک جملہ لڑکھڑاتا ہے۔ 'شام کا کھانا کھا کر جاتے تو اچھا تھا۔' اندر ہی اندر دل لرزتا رہتا ہے کہ اس کی یہ رسمی پیش کش شرفِ قبولیت سے نواز دی گئی تو یہ بلا ایک دن اور قہر برپا کرے گی۔ اسی لئے وہ مہمان کے انکار کرتے ہی اسے گلے لگا کر خدا حافظ کہتا ہے اور سکھ کا سانس لیتا ہے یا پھولتی ہوئی سانس درست کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اب ہمیں مہمانوں کی آمد سے مسرت کیوں نہیں ہوتی۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اس مادّہ پرستی کے زمانے میں روحانی مسرتوں کا کیا کام؟ کیا مادی ترقی کے اس عہدِ زرین میں بھی روح کا وجود باقی ہے۔ جی ہاں! روحانیت اب بھی زندہ ہے اور ثبوت اس کا یہ ہے کہ اپنے گھر کی دہلیز پر مہمانوں کا امڈتا ہوا سیلاب دیکھ کر جو چیز ہمارے اندر فنا ہونے لگتی ہے وہ ہماری روح ہی ہے۔

سنا ہے مادّہ فنا ہو جاتا ہے اور روح باقی رہ جاتی ہے، سو یہ بھی سچ ہے۔ روح کے بقا اور جہد للبقا کے مناظر ہمیں مہمانوں کی آمد کے بعد نظر آتے ہیں۔ ایثار، قربانی، (جو کبھی جھٹکے کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے) اور صبر و تحمل وغیرہ اخلاقی قدروں کو مہمانوں کی آمد کے بعد ہی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً کسی دن آپ کے مہمان کا لائق فرزند جب دبئی سے آپ کے کسی عزیز کے بھجوائے ہوئے ٹی سیٹ کو لیکر، جیک اینڈ جل، وینٹ اپ دہل، کہہ کر سیڑھیوں پر چڑھتا جاتا ہے تو آپ کا دل دہل جاتا ہے اور آپ جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگتے ہیں، پھر اچانک اس ٹی سیٹ کو کمرے کی فرش پر پوری قوت سے دے مارتا ہے، تب اسے خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ ٹی سیٹ نہیں آپ کا پیمانہ صبر ہے جو چھلکنے سے پہلے ہی چور چور ہو گیا۔ آپ اپنے چہرہ سے تلخی کو رفع دفع کرنے کی ناکام سی کوشش کر

کے اس پر کھسیانی ہنسی کا ملمع چڑھاتے ہیں اور یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں، 'کوئی بات نہیں بچہ ہی تو ہے۔' اور بچے کے والدین آپ کی زبان سے نکلی ہوئی اس ابدی سچائی کو صدقِ دل سے قبول کر لیتے ہیں۔

سیلاب کے آنے کا دن اور تاریخ بھلے ہی مقرر نہ ہو، موسم تو متعین ہے۔ مہمان اس قید سے آزاد ہے۔ جس مخلوق کے آنے کا وقت مقرر نہ ہو اس کے جانے کا دن کون طے کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب میزبان اپنے مہمانوں کا استقبال پھول جیسے ان دو سوالوں سے کرتے ہیں۔ (ان دونوں سوالوں کے درمیان سانس لینے کا وقفہ تو قطعی نہیں ہوتا)

سوال نمبر ایک : آئیے آئیے! کب تشریف لائے آپ؟

میزبان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ وہ غریب ابھی ابھی ٹیکسی سے اتر کر اپنے حواس درست کر رہا ہے۔ (یہ سوال شاید اس لئے کیا جاتا ہے کہ میزبان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا کہ اتنی بڑی مصیبت اس کے گھر وارد ہو چکی ہے)

دوسرا سوال : کب تک قیام رہے گا؟

پہلے سوال کا جواب تو اس کے روبرو ہوتا ہے لیکن جس طرح طلسمی کہانیوں والے جادوگر کی روح طوطے کے جسم میں چھپی ہوتی ہے، میزبان اس سوال میں پھنسا رہتا ہے۔ یہ سوال لازمی ہوتا ہے تاہم مہمان کچھ اس قسم کا گول مول قسم کا جواب دے کر اپنا راستہ اور میزبان کی طبیعت صاف کرتا ہے :

'جنابِ عالی! جب تک ہمارا دانہ پانی اس گھر میں ہے، ہم یہیں رہیں گے بلکہ آپ بھگانا بھی چاہیں تب بھی نہ جائیں گے۔ سمجھے؟'

ایسا شاندار جواب پا کر میزبان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے اچھا ہے کہ اس سے کفِ افسوس ملنے میں آسانی ہوتی ہے۔ رہی بات دانے پانی کی تو اب ہمارے زمانے میں دانے اور پانی میں وغیرہ وغیرہ کی خاصی لمبی دم لگی ہوئی ہے۔ عام آدمی

اس دم کو جتنا سیدھا کرنا چاہتا ہے یہ اتنی ہی ٹیڑھی ہوتی جاتی ہے۔بن بلایا مہمان بے چارہ اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ وہ کب اپنے دانے پانی کی سرحد پھلانگ کر صاحبِ خانہ کی مملکت میں بلا پاسپورٹ داخل ہو گیا ہے۔

اس دنیا میں انسان بذاتِ خود ایک بن بلایا مہمان ہے اور وہ بھی اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ جب تک اس کا دانہ پانی اس دنیا میں موجود ہے وہ یہاں سے ٹلنے والا نہیں، خواہ اسے دھکے مار کر ہی کیوں نہ نکالا جائے۔چنانچہ اب آدمی تلاشِ روزگار میں لوکل ٹرین اور سٹی بس کے دھکے کھاتا ہے اور بے تکان جیتا ہے۔آج کل دانے دانے ہی پر نہیں بس اور ٹرین کے دھکّوں پر بھی ہمارا نام لکھا ہوا ہے۔

شادی کے بعد

شادی کی رنگ برنگی تقریبات کو کسی نے بڑی دھوم سے نکلنے والے عاشق کے جنازے سے تعبیر کیا ہے۔ بات دل کو لگتی ہے، مشاہدہ بھی ہے کہ نکاح کے بعد زندگی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے شاید اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے، ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ شادی کے ذریعے چڑھنے والا رنگ چند ہی دنوں میں اس طرح اڑ جاتا ہے کہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا خواہ آپ نکاحِ ثانی ہی کیوں نہ کر لیں۔

ازدواجی زندگی کا ابتدائی حصہ بے پناہ خوشیوں سے پر ہوتا ہے۔ طرفین کو ان مسرتوں کا مرکز باور کر لیا جاتا ہے جو یہ نہیں جانتے کہ یہ ادھاری کا سودا ہے۔ دھیرے دھیرے ان پر کھلتا ہے کہ ان مسرتوں کو عمر بھر قسطوں میں لوٹانا ہے اور ازدواجی زندگی ایک شوگر کوٹیڈ گولی ہے۔ دولہے میاں کا کوٹ ابھی اترا نہیں اور شکر کا غلاف اترنے لگتا ہے۔ مشہور انشائیہ نگار مانتین نے شادی کو ایک ایسے پنجرے سے تعبیر کیا ہے جس میں داخل ہونے والے باہر نکلنے کے لئے پھڑ پھڑا رہے ہیں اور جو باہر ہیں اندر جانے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ سنا ہے انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن نے شادی کے بندھن میں بندھ جانے کے بعد اپنی شہرہ آفاق نظم Paradise lost لکھی تھی۔ چند برسوں بعد

اس کی بیوی داغِ مفارقت دے گئی تب Paradise Regained لکھ کر اس نے سکھ کا سانس لیا۔

شادی کے بعد چند عبوری ماہ وسال گزر جائیں تو شوہر کو بالفرض وہ ناقد ہے تو جلد ہی پتہ چل جاتا ہے کہ تنقید کے سرکش گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ سے نکل کر کسی دست نازک میں چلی گئی ہے، اگر وہ شاعر ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے، زندگی کا قافیہ تنگ ہو گیا ہے، ادیب ہے تو اسے لگتا ہے اب حدِ ادب سمٹ گئی ہے، طنز نگار پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات پر ایک بہت بڑا طنز ہے۔ آدمی بذاتِ خود ایک چلتے پھرتے لطیفے میں ڈھل گیا ہو تو لوگوں کو ہنسانے کے لئے کاغذ قلم کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے؟ قرضداروں سے سہما ہوا، بیوی سے ڈرا ہوا، نونہالوں سے لدا ہوا شوہر ایک ان کہا اور ان سنا لطیفہ ہی تو ہے۔

کسی کا سرتاج کہلانے والا یہ شخص ذمہ داریوں کے کانٹوں کا تاج سر پر پہنے مسکرانے کے لئے مسکرانا بھول جاتا ہے۔ وہ ہنستا اس لئے ہے کہ رو نہیں سکتا۔ روتا اس لئے نہیں کہ اس کارِ خیر کے لئے، مخلوقات میں سے سب سے زیادہ مشہور ہستی کا اس نے اپنے گھر میں تقرر کر لیا ہے۔ پردہ دار خواتین کی طرح رونا شوہر کے نصیب میں نہیں اس لئے وہ اپنے رونے کو مسکراہٹ کی زبان میں ٹرانسلیٹ کر لیتا ہے۔ لوگ اسے خفت مٹانا کہتے ہیں، حالانکہ چند برسوں بعد اسے نہ مسکرانے کی ضرورت ہوتی ہے نہ فرصت۔ یہ مسکراہٹ پھر تماشائیوں کے حصّے میں آتی ہے، مگر خندہِ زیرِ لب اچھالنے والے بھی کب تک خیر منائیں گے؟ وہ بھی کسی دن شادی کے جنجال میں گرفتار ہو کر بے بسی سے مسکراتے ہیں کہ ان کے بس میں بس یہی ایک کام رہ جاتا ہے۔ وہ زندگی جو گل وبلبل کے نغمے اور غزلیہ شاعری کی زبان میں گفتگو کیا کرتی تھی، شادی کے بعد سرکار اور سرکاری زبان بدلنے کے بعد دال آٹے کی زبان میں بات کرنے لگتی ہے۔

ہم ایسے چند سورماؤں سے بھی واقف ہیں، جنھوں نے شادی کا خطرہ محض اس لئے مول لیا تھا تا کہ ایک عدد قیمتی سوٹ پہننے کی دیرینہ آرزو پوری ہو سکے۔ شادی کا کوٹ دراصل پانی میں بہتے ہوئے اس روایتی کمبل کا جانشیں ہے جسے پکڑنے کے لئے ایک آدمی دریا میں کود پڑا تھا اور پھر اسی کمبل کا ہولیا۔ کنارے کھڑے ہوئے لوگوں نے اسے پکارا بھی کہ میاں! کمبل چھوڑ دو اپنی جان بچالو۔ اس پر وہ شخص بے بسی سے بولا، میں کمبل کو چھوڑتا ہوں، مگر کمبل ہی مجھے نہیں چھوڑتا۔

مذکورہ کمبل اور شادی کے کوٹ میں یقیناً جنریشن گیپ موجود ہے، البتہ اس کمبل کی نسلی خصوصیات شادی کے کوٹ میں اب بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بعض اوقات دولہے کی دلچسپی کوٹ تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ اپنے خسر محترم کی شیروانی کی جیب تک پہنچ کر ذرا سا دم لینے کے بعد پھیلتے پھیلتے آفاقی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ آبادی کے ساتھ اس قسم کے آفاقی شوہروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ وہ زمانے لد گئے جب کچی عمر اور ناسمجھی کے زمانہ میں ہاتھ پیلے کر دئے جاتے تھے۔ یوں بھی ناسمجھی کے اظہار کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں۔ آپ عمر کے ہر دور میں اپنی اس فطری صلاحیت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سمجھداری بھی عمر اور موقع محل کی قائل نہیں ہے۔ حالانکہ حکومت نے اسے متعین کرنے کی اپنی سی کوشش کرڈالی ہے۔ لیکن اب سمجھداری سرکاری دفتروں سے لائسنس بنوا کر اور ماہ سال سے اجازت لے کر نہیں آتی البتہ آپ سمجھداروں میں پائی جانے والی ناسمجھی ملاحظہ فرمانا چاہیں تو شادی کی تقریبات میں ضرور جائیے۔

نوشہ میاں کو آخر تک سمجھ میں نہیں آتا کہ ان پر ڈھیر سارے پھول کیوں چڑھا دئے گئے ہیں؟ اور جس دولہے پر سہرا نہ چڑھایا جائے وہ سوچتا رہتا ہے کہ آخر اسے چمن کیوں نہ بنایا گیا۔ ممکن ہے پھولوں سے لدے کسی نوشہ کو دیکھ کر ہی مشہور شاعر فانی بدایونی نے عمرِ گزشتہ کی میت والی ترکیب وضع کی ہو، گو یہ بات انہوں نے آتی جاتی سانسوں کے

متعلق ان الفاظ میں بیان کی تھی۔

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میّت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

دوسرا مصرع تو یقیناً شادی کے بعد کی زندگی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔
ہمارے دوست قبلہ مرزا صاحب کہا کرتے تھے، کسی نوشہ کو سہرے میں جکڑا ہوا دیکھ کر مجھے یاد آتا ہے کہ یہ ایک رسم ہے جو مرنے کے بعد ادا کی جاتی ہے مگر اس غریب کے ساتھ قبل از وقت ادا کر دی گئی اور کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام کچھ زیادہ قبل از وقت بھی نہیں ہوا ہے۔ یہ بات دولہے میاں کو سمجھانے میں حالات بھی وقت ضائع نہیں کرتے۔
یوں تو بہت سی باتیں ہیں جو شادی کے بعد بھی معمہ بنی رہتی ہیں مثلاً میرا دوست۔۔۔۔۔،
مگر ذرا ٹھہرئے مجھے یہاں اپنے دوست کا باقاعدہ نام لکھنا ہوگا، ورنہ خانہ جنگی کا خطرہ ہے کیونکہ بیشتر قارئین اپنی فطری ذہانت کا بے جا ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ ضرور کہیں گے کہ حضور آپ کے یہ نام نہاد دوست آپ خود ہی ہیں (ظاہر ہے کہ کوئی آدمی اپنا دشمن تو ہوتا نہیں) اور خواہ مخواہ دوست کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہے ہیں۔

ادیب اور خاص طور پر مزاح نگار ہونے کی سب سے بڑی قیمت ہمیں یہ چکانی پڑتی ہے کہ ہم اپنے بارے میں کوئی حقیقت بیان کریں تو لوگ اسے افسانہ نگاری قرار دیتے ہیں اور افسانہ گھڑیں تو اسے حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے اس دوست کا نام یہاں لکھ دوں تو کاندھا یقیناً میرا ہوگا، بندوق اس کی بیگم کے ہاتھ میں ہوگی اور گولی اس غریب کے سینے کے پار ہو جائے گی لہٰذا کیوں نہ اسے شیخ صاحب کا نام دے دیا جائے، یوں بھی اردو شاعری میں جس کے جو جی میں آئے شیخ صاحب کے سر منڈھنے کا رواج عام ہے۔

بہر حال ذکر ان بہت سی باتوں کا تھا جنہیں آدمی شادی کے بعد بھی سمجھ نہیں پاتا

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

مثلاً مذکورہ شیخ صاحب جنہوں نے اسی ماہ اپنی شادی کی سالگرہ بڑی دھوم دھوم سے منائی کہنے لگے کہ میں آج تک یہ گتھی نہیں سلجھا پایا ہوں کہ میری شادی میری بیوی سے ہوئی تھی یا اس ریڈیو سیٹ سے جو چند تکنیکی خرابیوں کے سبب ایک ہی وقت میں تین مختلف اسٹیشنوں کی آوازیں نشر کرتا ہے مثلاً بی بی سی لندن سے حالاتِ حاضرہ (جو نا گفتہ بہ ہوتے ہیں) کا پروگرام، وودھ بارتی کا پروگرام ' آپ کی فرمائش پر ۔ مائیکے کی تعریف اور پڑوسیوں کا سنگیت سمّیلن ، یہ سب ایک ہی سانس میں نشر ہوتا ہے ۔شوہر شادی کے کچھ عرصے بعد جہیز کے سامان کی فہرست دیکھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی منکوحہ واقعی اس کی شریکِ حیات ہے نہ کہ وہ ٹیپ ریکارڈر جو جہیز کے سامان میں جب نیا نیا آیا تھا تو اس کی آواز کمالِ احتیاط سے اپنے سینے میں محفوظ کر لیا کرتا تھا اور اسی طرح سنا دیتا ۔ چند مہینوں بعد اس میں یہ بگاڑ پیدا ہو گیا کہ اب وہ صرف اپنی ہانکتا ہے اور کسی کی نہیں سنتا ۔ ہم نے شیخ صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ٹیپ ریکارڈر اور بیویوں میں سے تقریباً ستّر فی صد کا سال دو سال میں یہی حال ہو جاتا ہے آپ بلا وجہ پریشان ہو رہے ہیں اپنی شریکِ حیات کی آواز کو اپنی آواز سمجھ کر ہاں میں ہاں ملائیے ۔

اسی طرح شیخ صاحب کا گمان ہے کہ ان کی شادی دراصل بیوی سے نہیں بلکہ اس جوسر Juicer سے ہوئی تھی ۔ جس میں رنگ برنگے پھل نہیں بلکہ ان کی خواہشات جھونک دی گئیں ہیں اور اس جوسر نے ان کا سارا الھڑ پن، کس بل اور تمام تر انفرادیت نکال دی، جوسر نہ ہوا گردشِ دوراں ہو گئی ۔ تمام پھلوں کے چہرے مسخ کر کے اجتماعی زندگی کا شربت بنا دیا ۔

اور آخری بات جو میں سمجھ نہیں پایا ہوں وہ یہ کہ شادی کے بعد میری بیوی نے جب مجھے 'میرے سرتاج' کہہ کر مخاطب کیا تھا تو یہ بحیثیت شوہر میری برتری کا اعتراف تھا یا اس کے ملکہ بن جانے کا اعلان؟

ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، ستمبر ۲۰۱۴

تم کو نہ ہم بھلائیں گے

عام خیال یہ ہے کہ بھولنا ایک مرض ہے۔اس کا ایک بھلا سا نام بھی ہے، نسیان۔ بیماری کا نام پروقار اور ذرا خوبصورت سا ہو تو اس کے ناز اٹھانے میں بھی مزہ آتا ہے اور مریض درد و آلام کی شدّت میں بھی افاقہ محسوس کرتا ہے۔ ہمارے آس پاس ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنھوں نے پروفیسروں اور دانشوروں کے بھلکڑ پن کے واقعات سن سن کر اپنی روز مرّہ زندگی میں دانشورانہ شان پیدا کرنے کی غرض سے قصداً یہ مرض پال رکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس پالتو مرض کی پول کھلتے دیر نہیں لگتی۔ ڈگری یافتہ یا خود ساختہ دانشوری اور اصلی گھی کی پہچان یوں بھی زیادہ مشکل نہیں۔ ہماری زبان یہ فرق فوراً واضح کر دیتی ہے۔

بھولنے کا مرض نہ صرف بے شمار مصائب اور بلاؤں کو ٹالنے کا ایک مجرّب نسخہ ہے بلکہ تسامح، سہو، فروگزاشت، بے خیالی اور احسان فراموشی سے لے کر خود فراموشی تک درجنوں گلیارے اور راستے ہیں جن میں داخل ہو کر آپ سماجی بلاؤں، احسان جتا کر بلیک میل کرنے والوں، عیار خود غرضوں، بے حس دوستوں، بھولے مفاد پرستوں اور استحصال کرنے والے حاکموں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں زندہ رہنے کے لئے انسان کے پاس روٹی کپڑا اور مکان کے علاوہ ایک عدد موٹی کھال ضروری ہے۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

بھولنا انسان کی فطرت میں شامل ہے ۔ انسان بنا ہی نسیان سے ہے، لیکن بھولنے کی عادت میں ذرا شدّت پیدا ہو جائے اور طبیعت میں جنوں کے آثار نمایاں ہو جائیں تو لوگ بھی آپ کو دیوانہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے ۔ نام نہاد فرزانوں کے اس سماج میں دیوانوں کو جو سہولتیں حاصل ہیں اور عقلمندی کے پردے میں عقل کی مندی سے بازار میں نفع حاصل کرنے کے جو مواقع موجود ہیں اس کے سبب یہ مرض بڑھا ہو نہ ہو، مریضوں کی تعداد میں اضافہ ضرور ہوا ہے ۔

ذکر نسیم ماموں کا تھا جن کے متعلق یہ طے کرنا دشوار تھا کہ آیا وہ سچ مچ جینیس بھلکّڑ تھے یا بھولنے کا سوانگ رچایا تھا ۔ اگر وہ بھولنے کی ایکٹنگ کر رہے تھے تو واقعی جینیس تھے کیونکہ ایسی زبردست اداکاری تو ہم نے صرف سیاست ہی کے پردے پر دیکھی ہے ۔ ناظرین کے لئے یہ طے کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا کہ ان کی بھولنے کی عادت فطری تھی، مرض کی شدّت تھی، محفلوں میں موضوعِ بحث بنے رہنے کی حکمت تھی یا ان کی لاابالی زندگی کی ایک ضرورت تھی ۔

یوں بھی ہماری زندگی اس قدر پیچیدہ اور دردناک ہے کہ اس کا بیشتر حصّہ البم میں سجانے کے بجائے کوڑے دان کی نذر کر دینے کے لائق ہے ۔ ماموں کے ابتدائی حالات شاید اتنے تلخ تھے کہ وہ شیریں یادوں کے حصّے میں آئی زمین پر بھی ناجائز قبضہ جما بیٹھے تھے، اور اب تو اس سرحد کے نشانات بھی گڈمڈ ہو گئے تھے ۔

ماموں کے پاس یادوں کے نام پر اسکول کے زمانے کے چند میڈلس تھے جو انھوں نے مختلف مقابلوں میں بڑے خلوص اور جانفشانی سے حاصل کئے تھے ۔ انھیں یہ یاد نہیں کہ کن مقابلوں میں کس پوزیشن پر پہنچنے کے لئے انھیں ان انعامات سے سرفراز کیا گیا تھا ۔ ماموں یہ بھی فراموش کر چکے تھے کہ وہ میڈلس رکھے کہاں ہیں ۔ ہاں انھیں یہ ضرور یاد تھا کہ جن دوستوں کو انھوں نے منہ توڑ شکست دی تھی، ہار ماننے کو تیّار نہ تھے اور اس

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

قدر سرکش واقع ہوئے تھے کہ بازار سے جاکر میڈلس کی دکان سے بڑھیا قسم کے میڈل اور ٹرافیاں خرید لائے تھے، اور اجنبی لوگوں کو گھر بلا کر شوکیس میں سجی جعلی کامیابی کی وہ نشانیاں دکھا دکھا کر شیخی بگھارا کرتے تھے کہ ہمیں اس مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا جس میں نسیم میاں کو تیسرا انعام دیا گیا تھا۔

بات اتنی سی نہ تھی اور نہ یہاں آ کر ختم ہوئی ان کی قسمت کے ستاروں کو یہ واقعہ اسقدر پسند آیا کہ بعد میں ان کے حالاتِ زندگی اسے " مکرّر ارشاد ہو" کہہ کر بار بار دہراتے رہے۔

ماموں کا نام نسیم احمد تھا گھر کے بزرگ انھیں نسیم میاں کہا کرتے تھے۔ نانا جان ان کے بھلکّڑ پن کے سبب بجائے نسیم میاں کے عجلت میں نسیاں بھی کہہ جاتے۔ ہم بچّوں کو جب تک اس لفظ کے اصل معنی نہیں معلوم تھے ہم یہی سمجھتے رہے کہ پیار سے بگاڑا ہوا ایک بے معنی سا مگر شہد جیسا میٹھا نام ہے۔ جب سیانے ہوئے تو اس میں چھپے شہد کی مکھّی کے ڈنک کا انکشاف ہوا۔

وہ کبھی اس حقیقت کو بھی فراموش کر جاتے تھے کہ رشتے میں وہ ہمارے حقیقی ماموں تھے۔ ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ گھر میں کئی خاندانوں کے بچوں کی اس قدر ریل پیل تھی کہ بچّوں کے ناموں کے ساتھ رشتے یاد رکھنا دشوار تھا، خاص طور پر اس شخص کے لئے جس کی میموری اس کے ذاتی موبائیل سے بھی کم ہو۔

ماموں نے اپنی کمزور یادداشت کے آگے کبھی گھٹنے نہیں ٹیکے، راستے نکالنا انھیں آتا تھا۔ اپنی خفّت مٹانے یا چھپانے کی غرض سے وہ ہم میں سے کسی کو ذرا الگ لے جا کر پوچھتے": بتاؤ ہم آپ کے ہیں کون؟" جواب خواہ کچھ بھی ملے، ماموں خوش ہو کر اور شاباش کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ پھراتے اور جمے جمائے بالوں کو اس طرح بے ترتیب کر دیتے کہ بغیر کنگھی کئے درست نہ ہو سکیں۔

بھولنے کی اس عادت کو چھپانے کی ان کی کوشش ہر جگہ جاری رہتی۔

ماموں ایک مقامی اسکول میں ٹیچر تھے۔کبھی کوئی ذہین طالبِ علم، انھیں ستانے یا اپنی لیاقت بتانے کے لئے کوئی مشکل سوال پوچھ بیٹھتا تو وہ اندر ہی اندر ذرا بے چین ہو جاتے۔ان کے لئے مشکل ترین سوال یہی ہوا کرتا کہ آج تاریخ کیا ہے؟ جسے وہ کیلنڈر دیکھے یا موبائل آن کئے بغیر، اورآپ کو کھانے میں کیا پسند ہے؟ جسے وہ ممانی سے پوچھے بغیر اور آپ سیر کے لئے دہلی جانا پسند کریں گے یا کشمیر جسے وہ استخارہ کئے بغیر نہیں بتا سکتے تھے۔ بہر حال کسی سیانے طالب علم کی تفتیش پر کسی دوسرے ذہین طالب علم کا نام اپنے حافظے سے نکالنا وہ ہر گز نہ بھولتے اوراسی کی طرف سوال اچھال کر کہتے، ہاں بھئی ذرا تم ہی اس سوال کا جواب دو۔اس حکمتِ عملی کا دوسرا اوار وہ پہلے طالبِ علم پر کرتے، یہ کہہ کر کہ، اتنی سی بات تمہیں نہیں معلوم؟

ایک دن ایک طالبِ علم ان کے پاس آیااور کہنے لگا۔"سر !میری طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے مجھے گھر جانا ہے چھٹّی چاہیئے" ماموں اس پر برسنے لگے، 'چھٹّی چاہیئے تو میرے پاس کیوں چلے آئے، اپنے کلاس ٹیچر سے بات کرو۔' اس سہمے ہوئے بچّے نے کہا "سر! آپ ہی تو ہمارے کلاس ٹیچر ہیں "۔ اچّھا تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

گھر پر ماموں کا برا حال تھا۔کبھی ممانی اور اکثر سارا گھر ان کا چشمہ، پرس، جرابیں، موبائیل اور پاس بک ڈھونڈنے میں مشغول رہتا۔ایسا محسوس ہوتا جیسے گھر نہ ہو، دریا میں کوئی بھنور ہو۔

گھر میں کئی موبائیل تھے۔کتنے تھے؟ عمرِ رفتہ کے عطا کردہ زخموں اور اپنے دشمنوں کی طرح موبائیل ہینڈ سیٹ کی تعداد کا صحیح علم ماموں کو نہ تھا۔ممانی اس فضول خرچی پر چراغ پا ہو جاتیں تو وہ اپنے پڑوسی اجّو بھیا کا حوالہ دیتے جس سے انھوں نے ایک مرتبہ سن لیا تھا کہ اس کے پاس سترہ موبائیل ہیں۔ممانی چڑ کر کہتیں "وہ ٹھہرا سیاسی آدمی، نہ اسکی آمدنی کا کوئی بھروسہ ہے نہ زبان کا، تم کہاں کے لیڈر رہو، وہ تو لوگوں کو امپریس

کرنے کے لئے لمبی لمبی پھینکتا ہی ہے "

کبھی ماموں کا موبائیل دست تہہ سنگ کی طرح کسی تکیے کے نیچے دبا ہوا ملتا، کبھی واش بیشن پر تو کبھی کسی کتاب میں سوکھے ہوئے پھول کی طرح رکھا ہوا پایا جاتا۔ ایک کو ڈھونڈنے کے لئے دوسرا فون استعمال کرتے بیل بجتی تو پتہ چلتا مطلوبہ موبائیل پھولوں کے گملے میں سجا ہوا ہے۔صبح سویرے وہ پھولوں کی مزاج پرسی میں مصروف تھے کہ کسی کا فون آ گیا اور اسے وہیں رکھ چھوڑا۔

ایک دن دیر سے کوئی نمبر ڈائیل کر رہے تھے۔ادھر سے جواب آتا تھا This number does not exist۔ممانی سے زیادہ دیر تک جب انھیں اس عالم میں نہ دیکھا گیا اور جھنجھلاہٹ کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو پوچھ بیٹھیں "آخر آپ کسے فون لگا رہے ہیں؟"

ارے بھئی چشمے کا نمبر لگا رہا ہوں کم بخت ملتا ہی نہیں۔"

"چشمہ بھی کوئی موبائیل ہے جو بج اٹھے گا۔"

اب ماموں کا دماغ روشن ہوا۔مگر وہ کہاں ہار ماننے والے تھے،اور وہ بھی اپنی ہی بیگم سے، بیرونی طاقتوں کی بات اور تھی۔فوراً پینترا بدل کر بولے "بس بس مجھ پر طنز نہ کرو۔ میں نے چشمے کا نمبر موبائیل میں نوٹ کر رکھا ہے وہی دیکھ رہا ہوں۔یہ ڈیزائین کافی پرانا ہو گیا ہے۔نیا چشمہ بنوانا ہے۔"

"ہاں ڈیزائین تو کافی پرانا ہو گیا ہے"!ممانی طنزیہ انداز میں مسکراتی ہوئی بولیں۔

' " مگر وہ پرانا چشمہ ہے کہاں؟"

"وہی تو ڈھونڈ رہا ہوں کمبخت ملتا ہی نہیں۔"

"اور یہ ماتھے پر کیا چڑھا رکھا ہے؟"

"اوہو !یہ جناب یہاں ہیں۔"

ماموں اپنی عادت سے مجبور دن بھر میں نہ جانے کتنے نام، کتنے کام اور نہ جانے کیا کیا بھول جاتے تھے۔مگر ہم ان کی ان مزیدار حرکات کے سبب انھیں شاید ہی بھول پائیں گے۔

بری نظر والے

اچھے لوگوں کی طرح بری نظر والے بھی ہر ملک وقوم اور ہر علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔مگر اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔یعنی جیسا کرتے ہیں ویسا ہی پاتے ہیں۔نظر کی خرابی ایک الگ مرض ہے اور نظر کی برائی ایک الگ چیز۔دور اندیشی، کم اندیشی، نا اندیشی کو نظر کی خرابی کہا جا سکتا ہے۔حسد، جلن اور رقابت یہ نظر کی برائیاں ہیں۔یوں تو نظر میں اور بھی ہزاروں برائیاں ہے، لیکن یہ وہ فقرہ ہے جو عام طور پر جاتے ہوئے ٹرکوں کی پشت پر لکھا ہوا نظر آتا ہے، اور اکثر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ ہی اس کے مخاطب ہیں۔تو مان نہ مان میں تیرا مہمان قسم کی اس مصیبت کو گلے پڑتا دیکھ کر آپ اسے اپنے ذہن سے جھٹکنے کی لاکھ کوشش کیوں نہ کر ڈالیں یہ احساس تو کہیں گیا ہی نہیں کہ راستے سے گزرتی ہوئی کوئی سواری آپ کے اجلے اجلے بے داغ کپڑوں پر کیچڑ اچھال کر ہوا ہوگئی ہے۔

نہ جانے کیوں ان بے ڈول، بے ہنگم سواریوں یا ان سواریوں کے نامعقول مالکان کے ذہنوں پر یہ خوش گمانی سوار ہوتی ہے کہ ہر راہگیر ان کی اس گلبدن گاڑی کو بری نظر ہی سے دیکھتا ہے، بعض اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہر شخص ان کے ٹرک کو

جس نظر سے دیکھ رہا ہے وہ صد فیصد حسد بھری ہے ۔ چند منچلے اس پر کس کر یہ فقرہ لکھوا دیتے ہیں، جلو مگر دیئے کی طرح۔

اس نیم شاعرانہ و نیم حکیمانہ خیال کا ناصحانہ انداز تو خیر پھر بھی سمجھ میں آتا ہے، لیکن 'بری نظر والے تیرا منھ کالا' اس ملفوظ کے متعلق یہ واضح نہیں ہو پایا کہ آیا یہ راہگیروں کے رخِ روشن پر کامینٹری ہو رہی ہے یا ان کے نکتہء نظر کا تنقیدی جائزہ لیا جا رہا ہے، یا پھر رو سیاہی کی بدّ عادی جا رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بری نظر والے تیرا منھ کالا، یہ ایک جامع کلمہ ہے بلکہ مرزا غالب کے اشعار کی طرح گنجینہء معنی ہے آپ اس سے کئی معنی نکال سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ راہگیروں کے لئے ایک دھمکی ہے کہ ٹرک سے برآمد ہونے والا دھواں تمہارا منھ کالا کرے گا۔ ماحولیاتی آلودگی کو روکنے کے لئے سرکار کتنے ہی قوانین کیوں نہ بنالے، اکثر ان قوانین کا مصرف سوا اس کے اور کچھ بھی نھیں کہ آپ ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو پولس کی جیب گرم ہو۔

سواریاں رات دن دھویں کے سیاہ بادل آپ کی منھ پر چھوڑ کر آپ کے سینے پر مونگ دلتی ہوئی گزرتی رہیں اور آپ غضبناک نظروں سے ٹرک کی پشت پر آویزاں، بری نظر والے تیرا منھ کالا یہ تحریر پڑھ کر صبر کا گھونٹ پی کر رہ جائیں، اور وقت سے پہلے اس دنیا سے اپنا منھ کالا کریں یعنی یہاں سے کوچ کریں کہ اس فقرہ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ اس کا ایک اور مزید برا مفہوم بھی موجود ہے جو نظر کی خرابی سے اعمال کی خرابی تک چلا جاتا ہے، اسی بدعملی کی کثرت نے ہمارے سماجی ماحول کو برباد کر رکھا ہے۔

ٹرک مالکان اندکورہ فقرہ اپنی سواری پر لکھوا کر گویا یک آئینہ راستہ چلنے والوں کے روبرو کر دیتے ہیں کہ دیکھو تمہاری یہ روسیاہی در اصل تمہاری بدنگاہی کا نتیجہ ہے۔ راستہ چلنے والے کی خیر اندیشی یا بداندیشی اپنی جگہ، لیکن سواری سے نکلنے والے دھویں کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ وہ لوگوں کی نظریں تاڑ کر اور فیتیں پہچان کر ان کے چہرے پینٹ

کرتا پھرے۔ نیت کا کھوٹ اور نظر کا قصور اپنی جگہ، اس بے قصور، بیچاری آنکھ کو کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے کہ دھوئیں کی ساری پریشانی اسے جھیلنی پڑتی ہے۔ رہ رہ کر میؔر کا یہ شعر سوال بن کر ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

سواریوں کی پشت اور دل وجاں سے اٹھنے والے اس دھوئیں نے انسان کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ آجکل دنیا میں بیشتر انسان یہی ایک کام پوری ایمانداری سے انجام دے رہے ہیں۔ ہر ایک کے اپنے اپنے وسائل ہیں۔ سواریوں سے برآمد ہونے والا دھواں بھی بہترین اور مقبول ترین وسائلِ مردم آزاری میں سے ایک ہے۔ سگریٹ کا دھواں بھی اس میں شامل ہے جو فاعل ومفعول دونوں میں سوز وگداز پیدا کرتا ہے۔

بری نظر والے تیرا منہ کالا

بظاہر یہ جملہ رقیب روسیاہ کا عام فہم اور آزاد ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر رقیب روسیاہ عشق، اردو شاعری اور ہر اس جگہ پائے جاتے ہیں جہاں معاملہ رقابت کا ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھلا راہ چلتے ٹرک کو راہگیروں سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے جس کے چلنے کے لئے الگ فٹ پاتھ بھی مقرّر رہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اکثر بڑے آدمی اپنی عظمت کا مینارہ ان ہی چھوٹے لوگوں کی قبر پر تعمیر کرتے ہیں۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ اپنا منہ ادنیٰ لوگوں کو منہ لگانے کے لئے نہیں بلکہ انہیں چٹ کر جانے کے لئے کھولتے ہیں۔

سہ ماہی طنز و مزاح، بنگلور

کوئی ان سے نہیں کہتا

آج صبح میری بیوی نے جھنجھلا کر اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا، اب یہ اخبار بند کروادیں، طبیعت بیزار ہوگئی ہے، ہر دن یہ ریپ کی خبریں پڑھتے ہوئے۔ میں نے کہا گھبراؤ نہیں، اب یہ خبریں جلد ہی اخباروں سے دھیرے دھیرے اوجھل ہو جائینگی۔ ادھر ہند پاک سرحد پر پھر جھڑپوں کی کوئی خبر شاہ سرخی بن کر آج کے اخبار کے سر پر سوار ہے اور جلد ہی یہ لوگوں کے ذہنوں پر بھی سوار ہو ہی جائیگی۔ اور ادھر معاملہ تھوڑے پر نمٹ گیا تو ٹھیک ورنہ کوئی نیا مسئلہ انشااللہ جلد ہی اٹھ کھڑا ہوگا۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ بیبیاں پردے میں جائیں نہ جائیں اس موضوع پر پردہ ضرور پڑ جائے گا۔

دہلی کی ایک بس میں کسی دوشیزہ کی آبروریزی کی خبر پڑھ کر ہندوستان کے ہر شہری کو یہ ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے ایک گھونسہ اس کے دل پر جڑ دیا اور دھیرے دھیرے اخباروں نے جیسے اس قبیل کی خبریں یا تو خوفِ فسادِ خلق سے دبا رکھی تھیں یا اسے سوئے اتفاق کہئے کہ پنڈورا کا بکس ان ہی دنوں میں کھلا، اس طرح کہ اخبار کا ہر صفحہ آبرو ریزی کی خبروں سے داغدار ہو گیا۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

خدا جانے آپ نے غور کیا یا نہیں کہ دہلی میں آبروریزی کے ایک معاملے پر ہم جس طرح بوکھلا گئے، ملک بھر میں سیکڑوں واقعات اور اجتماعی آبروریزی کی جو خبریں اس دوران اخباروں میں شائع ہوئیں، کیا ان بدنصیب خبروں کا حق نہیں تھا کہ ہم ان پر بھی اسی انداز میں بوکھلا اٹھتے؟ اور ان کو عنوان بنا کر ان پر بھی احتجاج کرتے۔ اس دوران ایسا محسوس ہوتا رہا گویا کوئی ہمارے چہرے پر لگاتار چانٹے جڑ رہا ہے۔ محفلوں میں بھی یہ خبریں کانوں میں اس طرح لٹکی رہیں جیسے عورتوں کے کانوں میں ایر رنگ ہمہ وقت آویزاں ہوتے ہیں۔

ملک بھر میں موبائیل، ٹی وی اور انٹرنیٹ کلچر کے بے تحاشا فروغ کے نتیجے میں ابھرنے والی تازہ فصل یعنی عصمت دری کے معاملات کو ہم نے سایڈ ہیڈنگ بنا رکھا تھا، دہلی ریپ کیس نے اسے شاہ سرخیوں میں جگہ دے دی۔ اب جب کہ چند اوباش نوجوانوں کی ہوس کا شکار اس لڑکی نے اپنی جان دے کر اس ہیڈنگ کو انڈر لائن کر دیا ہے تو پورے ملک میں احتجاج کی لہر اٹھی اور یہ سلسلہ تھمتا نظر نہیں آتا۔ عوام اس مسئلے کی سنگینی اور گھناؤنے پن سے اکتا چکی ہے۔ اس بیماری کے جو علاج تجویز کئے جا رہے ہیں، اس پر بھی عمل درآمد کی کوئی فوری صورت نظر نہیں آتی۔ بقول فیضؔ ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز ہے حالانکہ ہمارے درد بہت لادوا نہیں ہیں۔ ان خبروں کی سنگینی میں ذرا مختلف رنگ قوم کے باباؤں اور رہنماؤں نے بھی بھرنے شروع کر دئے ہیں۔ صنفِ نازک سے جڑے اس مسئلے پر جو مشورے خواتین کو دئے گئے کہ وہ بھی ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دیں، کیونکہ اب گناہگار نظریں بے حجابی پر اتر آئیں ہیں اور معاملہ دست درازی تک جا پہنچا ہے۔

وہ زمانے لد گئے جب ان کا دامن دراز ہوا کرتا تھا اور دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ان کی تنگ دامانی نے ماڈرن عاشق کے حوصلے بڑھا دئے ہیں۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

کبھی شکایتاً مرد دبی زبان میں اپنی مشکل اس طرح بیان کر جاتا تھا:

مجھ ہی سے سب یہ کہتے ہیں کہ رکھ نیچی نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

مگر صدیوں تک اس فطری تقاضے اور اصل مسئلے پر کسی نے دھیان نہ دیا تو پیرایہ اظہار بدلنا پڑا اور عملی شکل جو سامنے آئی ہے وہ صورتِ حال ہمارے روبرو ہے۔

تعجب ہے کہ علم و ہنر کی ترقی کے اس زرین عہد میں انسان اگر قدرت کے پیغامات کو سمجھنے سے کترا رہا ہے تب بھی انسانی فطرت کے راز تو کب کے طشت از بام ہو چکے، فرائڈ نے سیکس کے اسرار و رموز کھول کھول کر بیان کر دئے پھر بھی ہماری تعلیم گاہوں اور دانش کدوں میں ترقی کی باتیں کرنے والے انسانی نفسیات سے کیونکر نا بلد ہیں۔ فطرت سے کھلواڑ کرنے والوں نے جہاں عالمی پیمانے پر ماحولیات کے ڈھیر سارے مسائل پیدا کر کے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے وہیں انسانی نفسیات اور خاص طور پر سیکس کی نفسیات سے آنکھ موند کر سماج میں جس شہوانی آلودگی کو سکۂ رائج الوقت کے طور پر ہم نے قبول کر لیا ہے اس کی سزا تو ان واقعات کی شکل میں بھگتنی ہی پڑے گی۔

جنس زدگی کا شکار یہ طبقہ ماحولیاتی آلودگی کا شکار ہو کر بے باک ہو گیا ہے اور دست درازی پر اتر آنے کے واقعات دن دونی رات چوگنی ترقّی کرنے لگے ہیں۔ یہ دنیا ترقی کی دوڑ میں جہالت کے تاریک دور سے اتنی دور آ گئی ہے کہ اس میں بسنے والے افراد ان گھناؤنے جرائم کے لئے پھانسی کی سزا کو دقیانوسی اور دورِ جہالت کی چیز سمجھ کر قبول

کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ترقی کی نشانی کے طور پر سرِ عام عریانیت اور بربریت اسے ماڈرن ورلڈ کے شایانِ شان محسوس ہوتی ہے۔ اس ترقی یافتہ دنیا میں بھی پرانے خیال

کے لوگ بستے ہیں یا ان کا ضمیر انھیں اس حیوانیت کے خلاف احتجاج پر اکساتا ہے۔

آرائشِ خم وکاکل میں مصروف عورتیں اندیشہ ہائے دوردراز پر بھی توجہ دیں اور اپنے لباس کو مردوں کے لئے کھلا دعوت نامہ نہ بننے دیں یہ بات بھی ان واقعات کی روک تھام کے سلسلے میں کہی گئی۔ مگر یہ نیک مشورہ روشن خیال خواتین کو قبول نہیں۔ ایک بڑا طبقہ یہ چاہتا ہے کہ ہم تو بد پرہیزی کئے جائیں گے۔ عورتیں اشتعال انگیز لباس پہن کر نکلیں گی، تنہا رات دن جب چاہیں جس کسی کے ساتھ سفر کریں۔ ٹی وی، انٹرنیٹ، سڑکوں پر لگے اشتہارات اور عریانیت کا چلتا پھرتا اشتہار بنی عورتیں آپ کے آس پاس منڈلاتی رہیں۔ یہ تو ہوگا اس میں کٹوتی نہیں کریں گے۔ ہاں آپ اپنی مردانگی پر قابو رکھئے۔

ہم دو اور دو پانچ ہوتے ہیں یہ بھلے ہی تسلیم نہ کریں لیکن شہوانیت کو ابھارنے کے ہزار سامان اکھٹّا کر دینے اور ایک سے ایک سنہری مواقع فراہم کر دینے پر بھی بھوکا شیر اپنے شکار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ یہ فوراً مان لیتے ہیں۔

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا!

(بھوکے شیر کی نفسیات سمجھانے ہی کے لئے کیوں نہ ہو، دن بہ دن شیروں کی تعداد میں ہونے والی کمی کو روکنا بہت ضروری ہے۔)

کل ہمارے پڑوس میں گاؤں سے مہمان آئے تھے ان میں سے کسی خاتون نے جو بے چاری نئی چیزوں کے استعمال سے ناواقف تھی، کچن میں جس کی کھڑکیاں بند تھیں، گیس کا برنر کھول دیا اور بہت دیر تک کھلا رکھنے کے بعد چولہا جلانے کی کوشش کی نتیجہ ظاہر ہے، کچن آگ کی لپیٹ میں تھا۔ سب لوگ اس بیچاری کو کوستے رہے کہ اسے اتنی سی بات معلوم نہیں کہ جب کمرہ گیس سے بھرا ہو تو آگ نہیں جلائی جاتی۔

اس عورت کو تو سب جاہل کہہ کر کوستے رہے۔ یہ ہلکے الفاظ اس قوم کے لئے استعمال کرنا تو مناسب نہیں جسے یہ بھی پتہ نہیں میڈیا، ہمارے سماجی رہن سہن کے

انتظامات، اور مرد وزن کے آزادانہ تعلقات جو بارود گولہ تیار کر رہے ہیں اس کو آگ پکڑنے میں دیر نہیں لگتی۔ بلکہ یہ سارے سامان جمع کر دئے جائیں اور تب بھی آگ نہ لگے تو مردوں کی مردانگی پر سوالیہ نشان لگ سکتا ہے۔

آپ اس ذرا سی بات پر غور کرنے کے بجائے کوئی نیا مرہم چاہتے ہیں جو اس بیماری کا درماں ثابت ہو۔ حالانکہ ہمارے مذہب نے پردہ پوشی اور حجاب، رشتوں کی عظمت اور محرم و نامحرم کے تصّورات کے ذریعے سیکس کی اے بی سی ڈی برسوں پہلے گوش گزار کروادی ہے۔ اس مرض کا شافی علاج عورتوں کو ایک حد تک اپنی عزّت کی رکھوالی کرنے والے سسٹم میں موجود ہے مگر ہم اس مجرب نسخہ کو چھوڑ کر کوئی نیا فارمولہ چاہتے ہیں۔

نام نہاد روشن خیالی اور آزادی کے متوالوں کے حلق سے یہ بات اترنی مشکل ہے جس کے نتیجہ میں ملک بھر میں صنفِ نازک کے سر سے اسی طرح چادریں اترتی رہیں گی اور عصمتیں تار تار ہوتی رہیں گی۔

ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد

بوئے وفا اور کتے

وہ اخبار جو قتل و غارت گری کی خبروں اور اشتہا انگیز فلمی اشتہاروں سے سجے ہوئے ہوں گرم کیک کی طرح بکتے ہیں۔ اخبار میں اگر کتوں کی سی حرکات وسکنات یعنی لڑائی جھگڑے کی خبریں اور گوشت و پوست کی نمائش سے مزین تصویرِ بتاں نہ ہوں، تو انسانوں کو چھوڑیئے، کتے تک اس اخبار کو سونگھنا پسند نہیں کرتے (اگر اس خبار کو گوشت باندھنے کے لئے استعمال کرکے گوشت ولہو کی خوشبو سے مہکایا نہ گیا ہو) یہ اور بات ہے کہ ان دنوں تازہ اخباروں سے بھی اسی قسم کی مہک آنے لگی ہے۔

ہمارا مستقل قصائی رمضانی گوشت بکری کا کاٹتا ہے اور خون ہمارا چوستا ہے۔ قیمہ مانگئے تو کہتا ہے : 'حضور آج بھیجہ لے جائیے، بڑا عقلمند بکرا تھا۔ یوں بھی اس کی بہت ضرورت ہے، کھانے والے بہت مل جائیں گے۔

جس دن بھیجے کی فرمائش کریں تو کہتا ہے۔ صبح سے اتنے اور ایسے ایسے لوگ آئے کہ کچھ بھی نہیں بچا۔ لیجئے آپ کے لئے تو یہ مال حاضر ہے۔ کھٹا کھٹ دو چار ہاتھ چلا کر ردی اخبار پر گوشت کے ٹکڑے پھیلا کر کہتا ہے۔

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر

بات یہ ہے کہ پڑیوں کے کاغذات کا میں مستقل قاری ہوں اس دن سے جب

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

میری بیوی نے شکر کی ایک پڑیا کھولنے کے بعد یہ مژدہ سنایا تھا کہ لیجئے اب تو آپ کا نام بھی پڑیوں میں آنے لگا۔ دراصل مقامی اخبار میں میرا ایک مضمون چھپا تھا اور اسی کاغذ میں اس دن شکر بندھی ہوئی آئی تھی۔ بہر حال اس دن ایسے ہی ایک ردّی اخبار کو غور سے دیکھا تو اس میں ایک سفید فام کتیا کی تصویر نظر آئی۔ تصویر کے گلے میں پٹے کی طرح یہ خبر بھی لگی تھی کہ کتوں کی نمائش کے مقابلے میں مذکورہ کتیا اول انعام کی حقدار قرار پائی ہے۔

یہی تصویر ہمارے دوست مسٹر اے ٹو زیڈ نے کسی اخبار میں دیکھی تو انھیں بھی دیگر لوگوں کی طرح اس جانور کی خوبصورتی اور خوش نصیبی پر رشک آیا۔ موصوف کا حال یہ ہے کہ اب تک درجنوں ادبی اور غیر ادبی معمے بھر کر بھجوا چکے ہیں اور کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ قرعہ اندازی کے بعد حصہ میں آنے والی کوئی حقیر رقم بھی کبھی نہ جیت پائے۔ اس کتیا کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ اللہ قسم کیا پیاری کتیا ہے۔ جی چاہتا ہے کاش ہم بھی انسان نہ ہوتے کتے ہوتے۔

انعام پانا اور اخبار میں تصویر کا چھپ جانا کیا بڑی بات ہے۔ آج کل لوگ مقبولیت اور عظمت کو اخباروں اور رسائل میں نمایاں ہونے سے ناپنے لگے ہیں اسی لئے اب شہرت کے دیوانے خبروں میں بنے رہنے کے لئے جان توڑ کوشش کرتے ہیں۔ ایک مقامی لیڈر کے متعلق ایک صاحب فرمانے لگے صبح اٹھتے ہی وہ سب سے پہلے اخبار میں اپنی تصویر اور خبر تلاش کرتا ہے۔ پورا اخبار تہہ و بالا کر ڈالتا ہے۔ ہر جگہ سے مایوس ہو جاتا ہے تو سوچتا ہے کہیں نہیں تو کم از کم وفیات کے کالم ہی میں تصویر چھپ جاتی تو دیکھ کر سکون مل جاتا۔

مقبولیت کے پیمانے سے ناپیں تو کتا بہر حال انسانوں سے دو قدم آگے ہے۔ کہیں والدین کی نظر میں کتوں کے پلّے اپنی اولاد سے عزیز تر ہیں۔ اکثر اولاد کو اپنے بوڑھے ماں باپ سے زیادہ اپنے السیشین اور بلڈاگ پیارے ہیں کہ وہ بھاری قیمت ادا

کر کے خریدے گئے ہیں۔ماں باپ تو خیر مالِ مفت ہیں۔انسان مقبولیت کی دوڑ میں شامل ہوئے تو کتا آگے نکل گیا۔ثبوت اس کا اخبار میں چھپی تصویر،اول انعام کا حقدار قرار پانا۔کتے کی اسی مقبولیت سے متاثر ہو کر مسٹر اے ٹو زید کی طرح کئی لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال ضرور سر سرایا ہوگا کہ کاش ہم بھی کتے ہوتے۔کوئی لیڈران کے گلے میں وفاداری کا پٹہ ڈال دیتا۔کوئی حسینہ چچماتی کار میں براجمان ہو کر مرمریں باہیں اس کے گلے میں حمائل کر کے دیگر کتوں کو بھونکنے کا موقع فراہم کر دیتی یا کسی فیکٹری کا مالک مزدوروں کا گلا کاٹ کر حاصل کئے گئے بسکٹ کے چند ٹکڑے اس کے آگے ڈال دیتا یا اس کی ایک عدد بڑی سی دم ہوتی جسے کسی بڑے آدمی کے پیچھے ہلاتا پھرتا۔سوال یہ ہے کہ آخر کتوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جس کے سبب اعلیٰ سوسائٹی کے افراد اپنے بنگلے کے میں گیٹ پر یہ لکھوانا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔یہاں کتا رہتا ہے۔

کتوں کی صحبت سیر سپاٹے کی نہ سہی،امیرانہ ٹھاٹھ کی معراج تو بن ہی چکی ہے۔انسانوں میں وقت کے ساتھ جو بہت سی کمزوریاں پیدا ہوئیں ان میں خوئے وفا کا نکل جانا بھی ہے اسی کے طفیل غالبؔ نے برہمن کو کعبے میں دفن کرنے کی تجویز پیش کی ہے اور جس شعر میں یہ مشورہ دیا گیا ہے اسے سن کر ایک صاحب نے غالب کو بت خانے ہوتے ہوئے جہنم رسید کرنے کا فتویٰ دے دیا ظاہر ہے نہ غالبؔ ان کی سمجھ میں آیا نہ اس کا شعر۔

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اب انسانوں کا حال یہ ہے کہ وفا شعاری انسانوں میں ناپید ہو گئی تو اسے کتے جیسی حقیر مخلوق میں ڈھونڈنا شروع کر دیا انسان کو بے وفائی کی اس سے بڑی سزا اور کیا ملتی کہ ہم نے

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

اکثر صاحبِ ثروت لوگوں کو اس رسی سے بندھا ہوا پایا جس کے ایک سرے پر تو وہ خود تھے اور دوسرے پر ایک عدد کتا۔

پھر ہم نے لاکھ سر مارا کہ اس کا سبب کیا ہے؟

تھک ہار کر عقل نے جو سبب سمجھایا وہ یہ کہ ان مالداروں کے اپنے قریب و دور کے رشتہ داروں میں کوئی باوفا نہ ملا سبھی دولت کے چاہنے والے تھے، وفاداری بہر حال انسان کی نفسیاتی اور کاروباری ضرورت ہے۔ امیر لوگ کتے پال کر یہ ضرورت پوری کرتے ہیں کہ اس بے زبان کو پیسے سے پیار نہیں۔

کتوں کا بو سے گہرا تعلق ہے مجرموں اور قاتلوں کا سراغ بھی بو کے ذریعے کتوں کی مدد سے لگایا جاتا ہے یہ بڑی بات ہے کہ انسانوں کو کتوں میں بوئے وفا دستیاب ہوئی۔ یعنی انھوں نے سونگھ لی گویا انسان میں اتنا کتا پن تو اب بھی موجود ہے۔ بات کتے پن کی چل پڑی ہے تو یہ بھی عرض کر دیں کہ ابنِ آدم انسانیت نوازی میں بھلے ہی پیچھے کیوں نہ ہو، کتا پن کے معاملے میں دیگر جانوروں میں وہ کتوں سے دو قدم آگے ہی ہے۔ دورِ حاضر میں انسانیت کی ترقی پر نظر ڈالئے تو اس میں انسانی ترقی کا کم اور کتا پن کا اسکور زیادہ نظر آتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اخبار میں کتوں کی تصاویر کیوں نظر آتیں۔ اسی تصویر کو پھر کسی اخبار میں دیکھ کر مسٹر اے ٹو زیڈ نے رال ٹپکائی، کاش ہم بھی کتے ہوتے میں نے ان کی بات سن کر کہا کہ آپ غمزدہ نہ ہوں اس باوفا مخلوق کی چند صفاتِ حمیدہ میں آپ بھی برابر کے شریک ہیں۔ سگِ دنیا کی ترکیب بھی ہم نے سنی ہے آپ دنیا ہٹا کر شہرت رکھ دیجئے۔ تبھی تو اخبار میں چھپی تصویر پر رال ٹپک رہی ہے۔ یہ سنتے ہی میری بات کی تصدیق کرتے ہوئے مسٹر اے ٹو زیڈ نے وہی کیا جو ایک کتے کو دیکھ کر دوسرا کتا کیا کرتا ہے۔

جاں سِپاری برائے اردو

اور

اردو کی سُپاری

سنا ہے کسی زمانہ میں لوگوں کو اپنی زبان کا اس قدر پاس تھا کہ، پران جائے پر وچن نہ جائے، کہہ کر وعدہ نبھانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ اہلِ اردو نے اس سے آگے ایک قدم بڑھایا اور زبان سے مراد وچن یا زبان (جیبھ) نہ لیتے ہوئے اردو زبان ہی کو ُستیہ بچن' جان کر اس پر اپنی جان قربان کرنے کی ٹھان لی۔ کبھی خونِ دل میں انگلیاں ڈبو لیں تو کبھی خونِ جگر سے اس کے ادب کی آبیاری کی۔

سیروں خوں تنِ شاعر سے صرف ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے مصرع تر کی صورت

گزشتہ دنوں ایک شعری مجموعہ ہماری نظر سے گزرا، جسے شاعر نے اپنی بیوی کے زیورات بیچ کر زیورِ طبع سے آراستہ کیا تھا۔ ایک اور شاعر نے اپنا گھر بیچ کر یہ کارنامہ انجام دیا۔ البتہ اسی کے پہلو بہ پہلو یہ خبر بھی آئی کہ ایک صاحب کو اردو اکادیمی نے کتاب چھپوانے کے لئے رقم مہیا کی، انھوں نے کتاب چھپوانے کے بجائے بھینس خرید لی

اور فرہاد کی روایت کو زندہ کر دیا۔ انھیں اکادیمی نے نوٹس بھجوایا تو جواب لکھا کہ میرے حالات ناگفتہ بہ ہیں شعری مجموعہ شائع کر کے خاک فائدہ ! (اردو آج کل کوئی پڑھتا نہیں، کتابیں گھر میں پڑی پڑی کیا دودھ دیں گی؟) اردو شاعروں کی مدد کرنا بھی اکادیمی کے فرائض میں شامل ہے ۔ میں نے ان پیسوں سے ایک بھینس خرید لی ہے اور میرا کاروبار اچھا چل رہا ہے ۔ اس جزوی مالی تعاون کے لئے شکر گزار ہوں ۔ اکاڈیمی کے اربابِ اقتدار نے بھی، 'گئی بھینس پانی میں' کہہ کر اس معاملہ کو رفع دفع کر دیا۔

اس قسم کے واقعات کو تو استثناء ہی سمجھنا چاہئے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر چند رام بابو سکسینہ نے اردو کی تاریخ روشنائی سے لکھی، ہزاروں قلم کاروں نے اسے رقم کرنے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ اس زبان کی ترویج و بقا کے لئے وہ ہمیشہ سینہ سپر رہے۔

زبان تہذیب کا ایک اہم جزو ہے، قوم کا شناخت نامہ ہے زبان کی ترویج و بقا کو قومی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی ملک پر ہونے والے بیرونی حملے کے نتیجے میں تحفظ کی خاطر جو جنگ لڑی جاتی ہے اس کا مقصد صرف شہریوں کی جان مال اور زمینوں کی حفاظت ہی نہیں بلکہ اپنے قومی سرمائے، عزّت و ناموس کا تحفّظ بھی اس میں شامل ہے۔

دنیا کی تمام قومیں بجا طور پر اپنی زبان کو سرمایہ افتخار سمجھتی ہیں ۔ عربوں کو اپنی زبان کی برتری پر اس قدر ناز تھا کہ اس زبان کے سبب یہ خیال کرتے تھے کہ بولنا صرف انھیں آتا ہے پوری دنیا کے لوگ عجمی یعنی گونگے ہیں ۔ مشہور مجاہدِ آزادی اور انگریزی کی شاعرہ سروجنی نائیڈو نے اپنی ابتدائی تخلیقات ایک انگریز کو دکھائیں تو اس نے تعجب و تعصّب کے ساتھ یہ کہا تھا : انگریزی میں تم شاعری کروگی، یہ تو ہماری زبان ہے! اس جذبہ افتخار سے اہلِ اردو بھی خالی نہیں،

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر

یہ ہماری زبان ہے پیارے

(میرؔ)

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ

سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے۔

اگر اردو کا علاقہ اس طرح سمٹتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب گنے چنے لوگ یہ کہتے رہ جائیں گے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ۔۔۔

یعنی اس زبان کو بس ہمیں جانتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا۔

وہ زبان جسے اس کے بچپن میں ان مغل بادشاہوں نے قلعہ معلیٰ میں پناہ دی، جو خود دورِ زوال میں کشتہ تیغِ ستم تھے۔ مرزا غالبؔ جس نے اردو زبان کو تخلیقی بلندیوں سے ہمکنار کیا اور اس کے ادب میں جان ڈالی، وہ خود زندگی کی اذیتوں سے تنگ آ کر بار بار اپنی موت کی تاریخیں نکالا کرتا تھا۔ برٹش امپائر کے ظلم و ستم سے نبرد آزما ادیبوں شاعروں اور صحافیوں نے اپنی بے سروسامانی اور کسمپرسی کے باوجود قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے اس زبان کو اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ بادِ مخالف کے خلاف چراغ جلانے والوں میں مولوی محمد باقر، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، اور اردو کے بے شمار قلمکاروں کے رشحاتِ قلم سے اردو کا دامن اب بھی مالا مال ہے۔ ان کے قدم بہ قدم اردو کے شیدائیوں کا ایک کارواں چلا تھا اور چل رہا ہے، ناموافق حالات میں اردو کے چاہنے والوں نے اپنے آپ کو ایک ڈھال بنا کر پیش کیا، اسی لئے آج بھی یہ زبان زندہ ہے۔ یہ شیریں اور مقبول زبان ان جیالوں کی جاں سپاری کا ثمرہ ہے۔ ان ہی کے بل پر یہ چراغ روشن رہے گا۔

لیکن اردو کے میر جعفر اور میر صادق اور مادھو اور گھیسو سے خبردار! (مادھو اور گھیسو، پریم چند کے مشہور افسانے، " کفن" کے دو کردار ہیں جو شراب کے لئے اپنی بیوی اور بہو کا

کفن تک بیچ کر کھا جاتے ہیں۔)

اردو کے سینے میں خنجر گھونپنے والے دستانے میں آخر ہاتھ کس کا ہے یہ دیکھنا اور اسے بے نقاب کرنا بھی ضروری ہے۔ اردو کو تخلیقی سطح پر پروان چڑھانے والوں کی کمی نہیں لیکن جب اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے والا طبقہ ہی نہیں رہے گا تو آپ یہ تخلیقات کس سے اور کس طرح پڑھوائیں گے۔

آج اردو میں لکھنے والوں کو عام طور پر معاوضہ نہیں ملتا، کل اردو پڑھوانے کے لئے معاوضہ دینا پڑے گا۔ قلعہ معلّٰی کا دستِ شفقت جو اردو کے سر پر تھا آج بھارت کی چند ریاستوں میں سرکاری سرپرستی کے روپ میں موجود ہے (نوعیت اور معیار و مقدار خواہ کچھ بھی ہو) لیکن اردو کی سرپرستی سے جس طبقے نے اپنا ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا ہے وہ اہل اردو ہی ہے۔ اردو ہماری مشترک قومی ایکتا کی نشانی ہے مگر معاف کیجئے مسلمانوں میں سے ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو احساسِ کمتری میں مبتلا ہے اور اردو کو اپنی قومی شناخت میں شامل کرنے سے کتراتا ہے۔

جس طرح برقعہ اور ڈاڑھی کو وہ اپنے لئے مضر سمجھتا ہے، اردو زبان سے بھی بدکتا ہے۔ ہم اپنے گھروں اور دکانوں پر اردو میں بورڈ لکھ کر آویزاں کرنے سے کتراتے ہیں، حالانکہ اس کی چند جائز وجوہات بھی ہیں جو ہمارے ملک کا ایک المیہ ہے۔ ہم میں سے اکثر اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ ہم نے اپنی اولاد کو اردو میڈیم اداروں میں تعلیم میں دلوا کر اردو کا حق ادا کر دیا۔ اور جو یہ کام نہیں کرتے وہ اردو کے دشمن ہیں۔ لیکن کبھی اس پہلو پر بھی غور کریں کہ لوگ اردو میڈیم اسکولوں سے اس قدر متوحّش کیوں ہیں؟ سبب صرف یہ نہیں ہے کہ وہاں سے نکلنے والے طلبا اکثر اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ اس مسابقت کی ماری دنیا سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر پاتے، اکثر اردو اداروں کی تعلیم اس قدر ناقص ہوا کرتی ہے کہ ان کے طلبا اعلیٰ تعلیم کے میدان میں دقتوں کا سامنا کرتے ہیں اور عام طور پر ملازمتوں سے

محروم رہتے ہیں۔

ہر شخص کو اپنی زبان سے پیار ہے مگر اولاد کی زندگی اور اس کے مستقبل کو اس زبان کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا جس زبان کے نام پر ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ لینے والے اساتذہ ان بچوں کی تربیت کے لئے ادھر کا تنکا ادھر کرنے کو تیار نہ ہوں۔

اکثر اردو اسکولوں میں کیا ہوتا ہے اور کس طرح تعلیم کا گلا گھونٹا جاتا اس کے جو مناظر اس چشمِ گنہگار نے دیکھے ہیں اگر بیان کردئے جائیں تو ڈر ہے کہ نہ جانے کتنے ہاتھ میری گردن تک پہنچ جائیں گے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ جس زبان کو ہمارے گھروں سے زندگی ملتی تھی وہاں سے اس کا جنازہ نکل رہا ہے۔

گزشتہ سال ایک مسلم طالبہ نے جس نے انگریزی میڈیم سے تعلیم مکمل کی تھی امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ پوری ریاست میں اسے سراہا گیا۔اس طالبہ کے دادا ایک صاحبِ کتاب شاعر تھے جنھیں اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا تھا اور اس کی دادی کا ایک افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ایک اردو رسالے کے ایڈیٹر نے جو میرا دوست بھی تھا، مجھے فون کیا اور کہا، تمہارے شہر کی ہونہار بچی نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے ،اس بچّی کا انٹرویو لے کر بھجواو۔ جب وہ انٹرویو اس پرچے میں شائع ہوا اور میں اس کی ایک کاپی لے کر اس لڑکی کے والد کے پاس گیا تو انھوں نے مجھے پچاس روپئے یہ کہہ کر دئے کہ آپ اس پرچے کی قیمت لے لیں۔ میں نے کہا یہ تو تحفہ ہے آپ اگر دینا ہی چاہتے ہیں تو سو روپئے اس کا زرِ سالانہ دے دیجئے۔انھوں نے جواب میں کہا:

معاف کیجئے! پرچہ آکر پڑا رہے گا ہمارے گھر میں اردو پڑھنے والا کوئی نہیں۔

گزشتہ دنوں ایک صاحب نے جو ایک دیہات میں اردو اسکول میں ملازم تھے مجھے بتایا کہ وہ شہر میں اپنا تبادلہ کروانا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ تھا۔بس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اردو اسکول ختم ہو تو مجھے دوسری جگہ بھیجا جائے۔میں نے ایک سال کے اندر دھیرے

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

دھیرے بچّوں کا اسکول آنا بند کروایا اور اب میں شہر کے ایک مراٹھی اسکول میں آ گیا ہوں۔

میں نے ان سے پوچھا : اس ایک سال میں آپ کو اندازاً کتنی تنخواہ ملی ہوگی؟

کہنے لگے، یہی کوئی تین لاکھ روپئے۔

میں نے کہا : کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ وہ تین لاکھ روپئے آپ کی تنخواہ نہیں، بلکہ اردو کو ختم کرنے کے لئے سپاری تھی؟

مجھ جیسا مدرس جو اردو کی تدریس کے لئے مقرر کیا گیا ہے، سالانہ لگ بھگ چار پانچ لاکھ روپئے تنخواہ حاصل کرلیتا ہے، اس کے لئے اب یہ سوچنے کا وقت آ گیا ہے کہ سال بھر میں اتنی بڑی رقم لے کر موجودہ نسل کے اندر اور سماجی سطح پر اردو زبان کو زندہ کرنے کے لئے میں نے کیا کیا؟ کیا میری خدمات اس مرتی ہوئی زبان کے لئے آبِ حیات ثابت ہوئیں یا میں نے تنخواہ کی شکل میں، اس زبان کو ختم کرنے کے لئے سپاری لی ہے؟

مبارک کہہ نہیں سکتا

نئے سال کی آمد آمد ہے اور اس موقع پر مبارکباد دینے کا رواج ہے۔ ملنے اور بات کرنے کا بہانا ،لوگوں کے ہاتھ آیا ، سندیسوں سے لبریز موبائیل فون کمپنیوں کے مالکان، ہوٹلوں اور پارٹیاں سجانے کے لئے جن لوازمات کی اس موقع پر ضرورت ہے ان کے دکاندار، اور بھی بے شمار لوگ روزگار کی برسات کے لئے نئے سال کو مبارکباد کہتے ہیں۔

وہ لوگ جو زندگی کے عہد شکن حالات سے ذرا کم دو چار ہوئے ہیں، اس موقع پر نئے عزائم کرتے ہیں۔ البتہ پرانے لوگ، عزم وارادہ کے اس دھندے میں ذرا کم ہی پڑتے ہیں کہ یادوں اور تجربوں سے بھر پور ایک طویل کل ان کے پیچھے کھڑا ہوا ہے اور سامنے آنے والے کل میں منافع کی امید ذرا کم ہی ہے اس لئے وہ خوابوں کے اس کاروبار میں سرمایہ کاری کے چکّر میں نہیں پڑتے۔

ہم زندگی میں ہزار بار توبہ شکن حالات سے گزرے پھر بھی کچھ سبق نہ سیکھا ، یوں بھی ہم ہوم ورک کے معاملے میں ہمیشہ پیچھے ہی رہے۔ اب جب نئے سال کی آہٹ سنی تو پھر کئی عزائم کر ڈالے، شائد اپنے آپ کو یہ سمجھانے کے لئے کہ دنیا کو ہم پر بھلے ہی اعتماد نہ ہو، ہمیں تو اپنے آپ پر پورا بھروسہ ہے اور یہ کہ ابھی ہم نے ہار نہیں مانی ہے، ابھی تو میں جوان ہوں۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

نئے سال کو باقاعدہ شروع ہونے میں آدھا گھنٹہ تھا۔ہم اکثر سوچتے ہیں یہ نیا سال ہمارے اسکوٹر کی طرح چلتا کم ہے اور بار بار شروع زیادہ ہوتا ہے کبھی اسلامی سال، کبھی پارسی نیوایرڈے، کبھی بکرم ورش، کبھی تعلیمی یا مالی سال کے روپ میں۔ہاں مناتے ہیں اسے یکم جنوری کی شب اور یہ وہی لمحہ تھا جب ماہِ دسمبر کے آخری لمحات ہم سے رخصتی مصافحہ کررہے تھے۔ہم نے جناب میم کو فون لگایا بہت دیر بعد نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی ہیلو

بھئی نیا سال مبارک ہو،۔۔معاف کرنا۔۔کیا سورہے تھے؟

ادھر سے شیر کی سی دہاڑ سنائی دی ابے اوئے مشٹنڈے تجھے کیا یہی وقت ملا تھا مبارکباد دینے کے لئے؟ نیند سے جگا دیا!

نیا سال شروع ہو چکا ہے جناب!

تو کیا میں ناچوں، کیا صبح تک رک نہیں سکتا تھا کیا صبح یہ سال بھاگا جارہا تھا۔تو کون ہے تیرا نام تو بتا!

سردار جی کے لب و لہجے نے ان سے زیادہ زور وشور سے چیخ چیخ کر بتا دیا تھا کہ وہ کسی سردار جی کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

اوہ سردار جی رانگ نمبر، ویری ساری۔

اوئے نیا سال بھی شروع ہوا تو رانگ نمبر سے، اب آگے کیا ہوگا؟

ہم نے فون رکھ دیا۔اب اس کے بعد کسی سے اتنی رات گئے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی کہ ممکن ہے وہ بھی سورہا ہو۔

صبح جب میں دودھ کا پیکٹ لینے کے لئے نکّڑ کی دکان پر گیا تو قطار میں کھڑے ایک گاہک نے بتایا کہ لالہ جی کے یہاں بچّی ہوئی ہے۔میں نے لالہ جی کو اس پر

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

مبارکباد دی۔

بدھائی ہولالہ جی، بیٹی مبارک ہو۔

یہ سنتے ہی لالہ جی گرم دودھ کی طرح ابل کر چھلک پڑے چھڑک لو چھڑک لو، تم بھی ہمارے گھاؤ پر نمک چھڑک لو۔

بعد میں پتہ چلا کہ یہ لگا تار آٹھویں لڑکی ہے۔ لڑکے کی امید میں اس بار بھی ان کے لئے یہ سودا گھاٹے کا ثابت ہوا۔

میں دودھ کا پیکٹ لے کر لوٹ رہا تھا کہ مجّو پہلوان پر نظر پڑی تو یاد آیا کہ مجھے کل کسی نے بتایا تھا کہ ان کے گھر بیٹا ہوا ہے۔ سوچا اب اس خبر پر تو مبارک باد دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ ہم نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور کہا پہلوان صاحب بیٹا مبارک ہو۔

پہلوان صاحب نے ہمیں اوپر سے نیچے تک آنکھیں نکال کر دیکھا اور شاید یہ سوچ کر کہ یہ اکھاڑا نہیں ہے ورنہ ایک زبردست پٹخنی دے دیتے، خون کا گھونٹ پی کر کہا۔ جناب میں آپ کی بڑی عزّت کرتا ہوں اس لئے کچھ کر نہیں سکتا، کوئی دوسرا ہوتا تو۔۔۔۔۔، اور انھوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

آخر ہوا کیا؟ ہم نے حیرت سے پوچھا

ارے ہونا کیا ہے، پچھلے پانچ سالوں سے میں کارپوریشن کے الکشن میں کھڑے ہونے کے لئے ڈنڈ پیل رہا ہوں۔ ادھر مجھے پانچواں لڑکا پیدا ہوا اور آج کے اخبار میں خبر چھپی ہے کہ سرکار نے اعلان کر دیا کہ تین سے زیادہ اولاد والے اس الکشن میں کھڑے نہیں ہو سکیں گے اور آپ بولتے مبارک ہو، میں کیا کروں۔

ہم نے پہلوان صاحب سے معافی مانگی اور آگے بڑھ گئے۔ اب جو شامت آئی

تو مولوی کرامت علی سے سامنا ہو گیا اور بے اختیار منہ سے نکل گیا، مولوی صاحب نیا سال مبارک ہو۔

مولانا ناک سکوڑ کر بولے، لاحول ولا قوۃ الّا باللہ، آپ تو پکّے انگریز کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔ بھائی میرے یہ ہمارا سال ہے ہی نہیں جو تم پر جوش انداز میں مبارکباد دئے چلے جارہے ہو۔ یہ غیروں کے طریقے چھوڑو میاں۔ مجھے تو ایسا معلوم دے رہا ہے کہ یہ آپ ہی لوگ تھے کہ جب انگریز یہاں سے جارہے تھے تو تم انھیں تسلّی دے رہے کہ حضور دل چھوٹا نہ کریں، ہم تو صرف آپ کو یہاں سے نکال رہے ہیں، آپ کے طور طریقوں کو تو ہم دل سے لگا کر رکھیں گیں۔

مولانا کی تقریر تو اس کے بعد بھی جاری مگر ہمارا دماغ اور کان جواب دے چکے تھے۔

ان سے کسی طرح جان چھڑا کر میں نے گھر کی طرف رخ کیا۔ میرے آفس کے ساتھی مرزا رشید سامنے سے ہاتھ میں اخبار لئے آتے دکھائی دئے۔ ان کے سلام کے جواب میں میں نے نئے سال کی مبارکباد جوڑ دی، مگر انھیں بھی وہ ناگوار گزری۔

جناب گزشتہ سال بھی، مجھے یاد ہے، آپ نے سالِ نو کی مبارک باد دی تھی مگر کیا ہوا، دیکھئے ،چلتی بسوں میں ریپ ہو رہے ہیں، پورا اخبار ملک بھر کے اسی قسم کے واقعات سے بھر اپڑا ہے۔ کس امید پر مبارکباد دیجئے گا۔

ان کے لاجواب کر دینے والے جملے سن کر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

آگے راستے میں میرا دوست مبارک علی سائیکل پر گزرتا ہوا نظر آیا۔ جی میں آیا کہ بے اختیار اسے آواز دوں۔ مبارک ذرا ٹھہرو!

مگر میں رک گیا، یہ سوچ کر کہ کیا پتہ وہ بھی کسی قرض دار سے جان بچا کر جارہا ہو یا اس کی جان بھی کسی ایسی مصیبت میں پھنسی ہو کہ آج اسے اپنا نام بھی سننا گوارا نہ ہو۔

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

گھر پہنچ کر میں نے دودھ کا پیکٹ کچن میں بھجوا دیا اور ڈرائینگ روم میں چائے کا انتظار کرنے لگا۔ دس منٹ بعد بیگم چائے لے کر حاضر ہوئیں بیگم نیا سال مبارک ہو۔ ہاں آپ کو بھی مبارک ہو اور جو دودھ آپ لائے ہیں اس کی پھٹی ہوئی چائے بھی! یہ کہہ کر وہ چائے کا کپ پوری قوت سے ٹیبل پر پٹخ کر گزرے ہوئے سال کی طرح چلی گئیں۔ میں نے اس موقع پر یہ عزم کیا کہ اب کسی کو مبارک باد نہیں دوں گا۔

ماہنامہ شگوفہ، حیدر آباد، سالنامہ جنوری ۱۹۹۹

نوٹ

نوٹ بظاہر ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے لیکن ہر کاغذ کے ٹکڑے کا یہ نصیب کہاں کہ نوٹ کہلائے بلکہ نوٹ جو یقیناً کاغذ ہے اس کے بھی دو چار ٹکڑے کر دئے جائیں تو وہ بھی نوٹ نہیں رہ جاتا۔ ایک نوٹ مضامین کے مقطع میں ہوا کرتا ہے جو سخن گسترانہ بات کہنے کے کام آتا ہے، فٹ نوٹ کہلاتا ہے۔ اس جھگڑے کی جڑ کو مضمون سے باہر ہی رکھا جاتا ہے۔ اس کی ضرورت محض مضامین کی تفہیم کے لئے ہوا کرتی ہے البتہ بعض اوقات فٹ نوٹ کی تفہیم کے لئے بھی مضامین لکھے جاتے ہیں۔

نوٹ بمعنی روپیہ افہام و تفہیم کے لئے کسی فٹ نوٹ کا محتاج نہیں ہوتا، یہ ناسمجھوں کو بھی بہت کچھ سمجھا دیتا ہے اور جس کے پاس نوٹ نہ ہو وہ لوگوں کو سمجھا سمجھا کر تھک جاتا ہے، سننے اور دیکھنے والوں کے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا اور اس شخص کو کوئی کچھ نہیں سمجھتا۔ ہماری سرکار قومی یکجہتی کے لئے نوٹ کی پشت پر ۱۴ زبانیں لکھ مارتی ہے۔ نوٹ کی شدید ضرورت پہلے ہی عوام کے چودہ طبق روشن کر چکی ہوتی ہے اس لئے کوئی اس کے مطالعے میں سر نہیں کھپاتا۔ یوں بھی آجکل خرید کر پڑھنے کا رواج کم ہے۔

نوٹ کا شمار انسان کی بنیادی ضروریات میں کیا جاتا ہے کہ وہ ہر بنیادی اور بے بنیادی ضرورت کو پورا کرسکتا ہے۔اس کے چند فوائد اور بھی ہیں۔اس سے آدمی کی صحت اچھی رہتی ہے۔دماغ جگہ پر رہتا ہے۔کبھی کبھی عرش پر بھی پہنچ جاتا ہے۔نوٹوں کی کمی سے ہمیشہ سر میں درد رہتا ہے،زیادتی سے رات میں نیند نہیں آتی۔دن میں عام آدمی کو فلمی ستارے اور فلمی ستاروں کو انکم ٹیکس آفیسرس نظر آتے ہیں۔

سنا ہے گذشتہ زمانے میں روپیہ پیسہ سرے سے ہوتا ہی نہ تھا۔یوں تو آجکل ہماری جیب میں بھی نہیں ہوتا اور جب بھی ہونے کو ہوتا ہے اسے کچھ نہ کچھ ضرور ہو جاتا ہے۔ابتدا میں روپیہ نہ بلیک تھا نہ وہائیٹ ،نہ ہی انسانوں کے کالے گورے ہونے کا مسئلہ پیدا ہوا تھا۔یہ علّت اس وقت پیدا ہوئی جب ذرا زیادہ سفید قسم کے لوگ پیدا ہو گئے۔ممکن ہے روپۓ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا ہو۔اس زمانے میں لوگ چیزوں سے چیزیں بدل لیا کرتے تھے۔مثلاً بڑھئی کو جوتے کی ضرورت پیش آئی،اور یہ ضرورت انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے اور چلانے کے لئے شروع ہی سے پیش آتی رہی ہے۔تب بڑھئی ایک آدھ چارپائی موچی کی خدمت میں لے جا کر کھڑی کر دیتا اور جوتا پہن کر خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ آتا۔جولاہے کو اناج کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ کسان کو کپڑے کا ایک تھان نذر کرتا جس سے متاثر ہو کر وہ اناج کا ایک بورا اس کے ہمراہ بندھوا دیتا، وہ کہتا ہی رہ جاتا کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔

اس تاریخی دور کی کچھ جھلکیاں ہماری مجلسوں میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔چونکہ یہ مشینی دور ہے،اشیاء کا تبادلہ بڑی برق رفتاری سے ہوتا ہے۔ادھر ایک زنزناتا ہوا جوتا مکتوب الیہ کی طرف روانہ ہوا نہ ہوا کہ ادھر سے ایک کرسی دھڑ سے ارسالِ خدمت ہوئی۔ آخر کار صدر کو مداخلت کر کے معاملہ رفع دفع کرنا پڑتا ہے۔یہی فرض گذشتہ زمانے میں کوڑیوں نے انجام دیا۔لین دین کے اس کاروبار میں جب الجھنیں سر ابھارنے لگیں تو

ڈبل رول

محمد اسد اللہ

روپیہ پہلی بار کوڑیوں کا روپ دھارن کر کے انسانوں کے اس سیدھے سادے کاروبار میں بندر کی طرح کود پڑا، تبھی سے یہ بندر بانٹ شروع ہوگئی، جواب تک جاری ہے۔ سنا ہے اب وہ تمام بندر روپیہ کا چولا اتار کر بڑے بڑے شہروں میں جا بسے۔ ان کی بڑی بڑی کوٹھیاں، تجارتیں اور فیکٹریاں ہیں۔ غرض اس راستے سے انسانوں کے کاروبار میں پہلے کوڑیاں آئیں، پھر چمڑا، پتّھر، سونا چاندی وغیرہ دھاتوں کا داخلہ ہوا اور جب مرزا غالب نے فرمادیا کہ:

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

تو لوگوں کی تجوریوں نے ان وزنی سکّوں کے بارِ گراں سے نجات پائی، عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ اس طرح کاغذی نوٹوں کا چلن عام ہوا۔ ہلکے پھلکے کاغذی نوٹوں کو دیکھ کر لوگ بہت خوش ہوئے، اس خیال سے کہ ان کاغذی ٹکڑوں کو ہم جب جس طرح چاہیں چلالیں گے۔ جس طرح بے وزن بے حیثیت اور کمزور آدمی کو لوگ انگلیوں پر چلا لیا کرتے ہیں، (زیادہ کمزور ہو تو تگنی کا ناچ بھی نچا لیتے ہیں)، یہی نیک ارادے وہ نوٹوں کے ساتھ بھی روا رکھنا چاہتے تھے۔ عین وقت پر اس انکشاف نے ان کے ارادوں پر پانی پھیر دیا کہ ریزرو بینک میں ان نوٹوں کے پیچھے بڑی وزن دار شے رکھی ہے۔ (یہ خوف ایسا ہی تھا جیسے کسی کمزور آدمی کے بارے میں اچانک پتہ چل جائے کہ اس کے تعلقات کسی وزن دار آدمی سے ہیں)۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ جدید شاعری کے علاوہ ہر چیز میں وزن ضروری ہے۔

زمانے کے ساتھ معیار بدل جاتے ہیں۔ پہلے سورج زمین کے گرد چلا کرتا تھا اور بڑی سعادت مندی کے ساتھ مسلسل لاکھوں برسوں تک سر جھکائے چلتا رہا۔ بھلا ہو گیلیلو کا جس نے اس سفر سے اسے چھٹکارا دلایا۔ اور زمین کو سمجھایا کہ 'میڈم! اب زمانہ عورتوں کا آرہا ہے آپ کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ چلنا چاہئے' چنانچہ اس کے بعد

زمین سورج کے گرد چلنے لگی۔ اس واقعہ کا الٹا اثر یہ ہوا کہ پادریوں نے گیلیلو کا چلنا پھرنا حرام کر دیا۔

شروع شروع میں انسانوں نے کوڑیاں چلائیں، پتھّر، سونا، چاندی وغیرہ دھاتیں چلائیں بلکہ لکھنو کے چند بانکوں نے تو اپنی مونچھوں کے بال تک چلا لئے۔ یوں تو آج بھی لوگ اپنی پگڑیاں، داڑھیاں، شیروانیاں چلا ہی رہے ہیں۔ بات دوسری طرف چل پڑی۔ بہر حال زمانہ بدلا۔ یعنی اونٹ نے کروٹ بدلی تو جہاں آدمی سکّے چلایا کرتھا وہیں سکّوں نے آدمی کو چلانا شروع کر دیا۔

سکّوں کے ارتقاء کا سرسری مطالعہ ہمیں یہ بتا تا ہے۔ کہ پچھلے زمانے کے پتھّر اور چمڑے کے سکّے آج روبل ڈالر، پیٹروڈالر اور ین بن کر دنیا بھر میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ نوٹوں کی اس ترقّی نے انسانوں کی دوڑ کو ریورس گیئر میں چلا کر ترقّیِ معکوس سے ہمکنار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ پیسہ کی اس ریل پیل نے انسانوں کو دو کوڑی کا نہ رہنے دیا۔ اب یہ عالم ہے کہ کاغذ کا ایک حقیر سا ٹکڑا آدمی کے دام بڑھا دیتا ہے اور پل دو پل میں اس کی جیب سے اتر کر اسے لوگوں کی نظروں سے اتار دیتا ہے۔ لوگوں کی نظریں نہ ہوئیں تھرمامیٹر ہو گیا۔ یوں بھی جہنّم کے بعد نوٹوں کی گرمی مشہور ہے۔

ہمارے ہاتھ نوٹ اور مزید نوٹوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہمیشہ بے قرار رہتے ہیں۔ نوٹ کا آنا بقول غالبؔ جانے کی تمہید ہے۔ یہ چھوئی موئی کا پودا ہے، ذرا سا چھوا اور سمٹ گیا۔ دنیا کا کوئی شیشہ نوٹ سے زیادہ نازک نہیں ہاتھ لگا اور چور چور۔ پھر بھی حیرت ہے لوگ اسے دانتوں سے پکڑنے کی سعی میں عمریں اور بتّیسیاں گنوا بیٹھتے ہیں۔